(مجموعہ مضامین)

انور مسعود

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت
مفید اور معیاری کتابیں
پبلش کرنے والا ادارہ

عمار مسعود

کے نام

تقریب

تقریب کچھ تو ــــــ	9
فلکِ عطارد (جاوید نامہ کا ایک باب)	11
اکبر الٰہ آبادی (از خواجہ محمد زکریا)	27
کاروان حرم (ع س. مسلم کا ایک امتیازی کارنامہ)	41
دو آتشہ (اسیر عابد کا دیوانِ غالب)	69
شریف کنجاہی ــــــ چند تاثرات	81
امجد اسلام امجد	93
خاقان خاور اور اس کی غزلیں	103
جموں و کشمیر (ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ)	117
جلیل عالی کا خواب دریچہ	126
بشیر سیفی کی خاکہ نگاری پر ایک نظر	139
پُھلواری	147
اسلم کمال او سلو میں	156
بشیر مُنذِر کی یاد میں	169
جمشید مسرُور ــــــ سمندر پار ایک پاکستانی آواز	183
گفتنی ناگفتنی	199
عذرا وقار کا تجزیۂ وارث	207
قومی ترانہ۔ ایک بصری جہت	219

تقریب کچھ تو .....

تنقید میرا میدان نہیں ہے ۔ میں اس کے رموز اور مخصوص طرزِ بیان سے بھی باخبر نہیں ہوں۔ یہ مجموعہ محض تعارفی مضامین پر مشتمل ہے ۔ اِن اٹھارہ مضامین میں سے پہلا مضمون علّامہ اقبال کی عظیم تصنیف ' جاوید نامہ ' کے ایک باب کی ترجمانی کی ایک کوشش ہے ۔ نو مضامین اُردو اور پنجابی کے جانے پہچانے شعرا کے کلام کے جائزے پر مشتمل ہیں جبکہ چھ مضامین حال ہی میں شائع ہونے والے اُردو کے چند نثری کارناموں کے تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ایک مضمون ایک مترجم اور ایک مضمون ایک مصوّر کے کمالِ فن کے اعتراف کی ذیل میں آتے ہیں ۔

جن شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے ان میں سے اکثر کو

میں بہت قریب سے جانتا ہوں اس لیے ان کی شخصیتوں کے کچھ ہالے اور حوالے بھی ان مضامین میں در آئے ہیں۔ بیشتر مضامین ادبی شخصیات وکتب کی تعارفی تقریبات کے موقع پر تحریر کئے گئے۔

مَیں اس بات کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مضامین لکھنے کی تحریک محبت' ارادت اور وابستگی کا وہ رابطہ ہے جو میں ان شخصیات کے لئے اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ اس رابطے کے قرب اور تقریبات کی مناسبت ہی سے اس مجموعے کا نام "تقریب" تجویز کیا گیا۔ میری اس تجویز کو ڈاکٹر بشیر سیفی صاحب کی تائید بھی حاصل ہے۔ میں سیفی صاحب کا بے انتہا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں مجھے مرحلہ بہ مرحلہ اپنے نہایت قیمتی مشوروں اور گرانقدر تعاون سے نوازا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء — انور مسعود

فلکِ عطارد
(جاوید نامہ کا ایک باب)

(حضرت علامہ اقبال بیسویں صدی کے عالمِ اسلام کے بے مثال شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم مفکر بھی ہیں ۔ انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی ، سماجی اور معاشی مسائل کو اپنی نثری تحریروں کا موضوع بھی بنایا اور اپنی شاعری میں ان موضوعات کو جذبے کا لمس بھی عطا کیا ۔ علامہ نے اپنے اردو کلام میں 'خضرِ راہ' اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کے علاوہ بھی کئی ایک منظومات میں خلافت و ملوکیت ، اشتراکیت ، سرمایہ داری ، لادینی سیاست ، مغربی جمہوریت اور تہذیبِ حاضر کے مختلف پہلوؤں پر اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ۔ ان تمام موضوعات پر انہوں نے جس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ 'جاوید نامہ' میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے نئی نسل کے سامنے پیش کیا جائے جو کہ فارسی سے تقریباً نابلد ہوتی جارہی ہے ۔)

تمام نقادانِ فن اس بات پر متفق ہیں کہ 'جاوید نامہ' علامہ اقبال کی لازوال تصنیف ہے۔ یہ کتاب دانتے کی 'ڈیوائن کامیڈی' (Divine Comedy) کے انداز میں ایک طویل نظم ہے جس میں شاعر نے افلاک اور آنسوئے افلاک کی سیر کی ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی زیادہ تر توجہ دوہ حیاتِ انسانی پر ہے۔ یعنی وہ زندگی جو اقوامِ مشرق کی سیاسی، معاشی اور اقتصادی پستی کے باعث موت سے بد تر ہو چکی ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس عظیم تصنیف میں اس اخلاقی، سیاسی اور عمرانی نظام کا مفصّل خاکہ پیش کردیا ہے جو قرآنِ حکیم اس دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کتاب میں اقبال نے اپنے شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ وہ مبلّغِ اسلام بھی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی اس سیارہ بہ سیارہ سفر میں اقبال کے رہنما ہیں۔ در اصل یہ کتاب عالمِ خیال میں مشاہیرِ عالم سے اقبال کی ملاقاتوں کا تذکرہ ہے۔ ان ملاقاتوں میں حیات و کائنات سے متعلق عظیم مباحث بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔

اس سفر میں علّامہ اقبال کی ملاقات جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا سے بھی ہوئی ہے۔ علّامہ نے ان شخصیّتوں سے ملنے کے لیے فلک عطارد کو منتخب کیا۔ ستارہ شناسوں کے نزدیک یہ سیارہ (MERCURY) مذہبی، متحرک اور سیماب وش شخصیّتوں سے متعلق ہے۔ اس اعتبار سے یہ انتخاب بڑا موزوں ہے۔

چونکہ اس مضمون کا موضوع حضرت علّامہ اقبال اور سید جمال الدین افغانی کی باہمی گفتگو ہے۔ آغازِ مضمون سے پیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی شخصیّتوں کا مجمل سا تعارف پیش کردیا جائے۔

جمال الدین افغانی انیسویں صدی کی انتہائی انقلابی شخصیت تھے۔ وہ ملوکیت کے زبردست دشمن اور اسلام کی حقّانیت کے زبردست داعی تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے تمام دنیائے اسلام کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ قرآنِ کریم سے بڑھ کر کوئی صحیفہ، کوئی ضابطہ اور کوئی

نظامِ بنی آدم کی روحانی ' اخلاقی ' سیاسی اور مادّی ترقّی کا ضامن نہیں ۔ ان کی ساری زندگی سخت کوشی کی ایک داستان ہے ۔ انہوں نے اپنی دینی فراست اور ذاتی قابلیت کی بدولت تمام سیاسی ' تمدّنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کردیا ہے ۔

سعید حلیم پاشا بھی افغانی کی طرح ایک بلند پایہ سچّے مسلمان تھے ۔انہوں نے ترکی زبان میں اپنی تصانیف میں عقلی اور نقلی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے ۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی دنیا کے موجودہ اِنحطاط کا سبب یہ ہے کہ اصُولِ اسلام کی عملی تعبیر غلط اور ناقص طریقہ سے کی گئی ہے ۔

حلیم پاشا اور جمال الدین افغانی کے نظریات آپس میں بہت حد تک مماثل ہیں ۔ علّامہ اقبال بھی ان افکار سے متفق ہیں ۔ انہوں نے انہی افکار کو فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔

علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبان سے وطنیت (NATIONALISM)' ملوکیت (IMPERIALISM)' اشتراکیت SOCIALISM اور قرانی نظام زندگی پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ضمنی طور پر پردہ اور ضبط تولید (FAMLKY PLANNING) بھی زیر بحث آگئے ہیں۔

اس آسمانی سفر میں علّامہ فلکِ قمر کے بعد فلکِ عطارد پر وارد ہوتے ہیں۔ یہاں پر مرشد رومی علامہ کو زندہ رود کے نام سے جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا سے متعارف کراتے ہیں ۔

روح افغانی سے ملاقات سے پیشتر اقبال نے ایک فلسفیانہ تمہید بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنی ذات کے ممکنات کی تجلّیوں کا تماشا کر سکے تو زمان ومکان کو مسخّر کرسکتا ہے ۔ قلبِ مومن کی وسعت لا متناہی ہے ۔ یہاں تک کہ ساری کائنات اس میں سما سکتی ہے ۔ اور یہ بزم وجود ہمارے باطنی احساس کا خارجی ظہور ہے ۔

فلکِ عطارد پر پہنچنے کے بعد حضرتِ اقبال' رومی سے دریافت کرتے ہیں کہ یہاں پر زندگی کے آثار تو کہیں نہیں ہیں پھر یہ اذان کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟ رومی نے

بتایا کہ حضرتِ آدم نے جنت سے رخصت ہونے کے بعد یہاں کچھ روز قیام کیا تھا۔ یہاں کی فضا میں ابھی تک ان کی آہوں کا سوز کارفرما ہے۔ یہاں پر اکثر بزرگانِ دین اکتسابِ فیض کے لئے آتے ہیں۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہاں پر دو آدمی نماز ادا کررہے ہیں۔ رومی نے بتایا کہ امام حضرت جمال الدین افغانی اور مقتدی سعید حلیم پاشا ہیں۔ اس دَور میں مشرق نے ان سے بڑھ کر کوئی شخصیت پیدا نہیں کی۔ افغانی، قرآنِ پاک کی سورہِ والنجم کی تلاوت فرمارہے تھے۔ ان کی پر سُوز قرأت سے قرآنِ مجید کے حقائق روشن ہوتے جارہے تھے۔ رومی اور اقبال نے بھی اس نماز با جماعت میں شرکت فرمائی۔ نماز کے بعد مولانا روم نے حضرت افغانی سے علامہ اقبال کا تعارف کرایا کہ یہ وہ شخص ہے جس کا دل دین وملّت کے درد سے معمور ہے اور اس نے اپنی ساری زندگی خودی کی تربیت اور اصلاح میں بسر کی ہے۔

حضرت افغانی نے علامہ اقبال سے پہلا سوال یہ کیا کہ اے زندہ رود کرۂ ارض کے کچھ حالات ہمیں بتا اور خصوصی طور پر اس دور کے مسلمانوں کی حالت سے آگاہ کر۔

اقبال نے جواب دیا کہ اسوقت مسلمانوں پر وطنیت کا بھوت سوار ہے۔ ملّت اسلامیہ کے ضمیر میں دین اور وطن بر سرپیکارہیں۔ ضعف کے باعث ان کے جسم میں روح مردہ ہو چکی ہے۔ اسلام کی قوت سے وہ ناامید ہو چکے ہیں۔ ترک ' ایرانی ' عرب اور ہندی سب کے سب فرنگی تہذیب کے زیر اثر آچکے ہیں۔ ایک طرف تو یورپین اقوام نے مسلمانوں کو سیاسی ' معاشی اور ذہنی طور پر اپنا غلام بنا لیا ہے اور دوسری طرف اشتراکیت کے باعث وہ اپنے دین سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں یعنی عالم اسلام اس وقت اشتراکیت اور وطنیت کی چکی کے دوپاٹوں کے درمیان پس رہا ہے۔

علامہ اقبال کی اس گزارش احوال کے بعد حکیم افغانی دین ووطن کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ مغربی سیاستدان سراپا مکاری اور عیاری ہیں۔ انہوں

نے مسلمانوں کو دین سے بیگانہ کرنے کے لیے وطنیت کی تعلیم دی ہے ۔ خود تو وہ مرکزیت کی فکر میں ہیں اور مسلمانوں کو وطنیت کے بھیس میں نفاق کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اسی سازش کے تحت انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا ہے ۔ اب صلاح کاراستہ یہی ہے کہ مسلمان مٹّی اور پتّھر کو اپنا نصب العین نہ بنائے کیونکہ یہ مسلک اسلام کی ضد ہے ۔ دین اسلام تو مادّے سے بلند تر ہونا سکھاتا ہے تاکہ مسلمان اپنے صحیح مقام سے آگاہ ہو سکے۔ مؤحد تو اس ساری کائنات میں بھی نہیں سما سکتا جبکہ وطنیت انسان کو وطن کی چاردیواری میں محدود کردیتی ہے ۔ افسوس ہے مسلمان پر اگر وہ اپنی روح کو مٹّی میں ملادے۔ یہ بجا ہے کہ انسانی جسم مٹّی سے پیدا ہوا ہے لیکن حیف ہے اس پر اگر وہ اس مقامِ سفلی سے بلند نہ ہو سکے ۔ جب ایک مسلمان عشقِ دین اختیار کرتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں ہر قید وبند سے آزاد ہوجاتا ہے ۔ وہ تو آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا شہباز ہے۔ شہباز چوہوں کی سی زندگی بسر نہیں کرسکتا ۔

یہاں پر حضرتِ افغانی ایک انتہائی باریک بات بیان کرتے ہیں کہ اسلام نسبتِ وطنی کا منکر نہیں۔ مسلمان کی فطرت کسی خاص وطن سے بالاتر ہے وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مشرقی یامغربی نہیں بلکہ آفاقی ہے ۔ بے شک سورج مشرق سے نکلتا ہے اور اس لحاظ سے مشرق سورج کا وطن ہے لیکن وطن سے سفر کرتا ہوا جب نصف النّہار پر پہنچتا ہے تو ساری دنیا پر چھاجاتاہے ۔ اسی طرح مسلمان ' پاکستانی ' ترکی ' مصری یا ایرانی ہوتے ہوئے بھی ساری کائنات کی تسخیر کیلئے پیدا ہوا ہے۔ یہ ساری دنیا اسکا وطن ہے۔ ہمارے پیغمبرِ اکرم ﷺ کی وطن سے ہجرت اس بات کی محکم دلیل ہے کہ نصب العین انہیں وطن سے بڑھ کر عزیز ہے ۔

وطنیت کے اس گمراہ کن فلسفہ کے مفاسد بیان کرنے کے بعد حکیم افغانی نے اشتراکیت اور ملوکیت کو ہدفِ تنقید بنایا ہے ۔ دراصل مرحُوم کی زندگی انہی تینوں نظریوں کی تردید میں گذر گئی ۔

علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبان سے اشتراکیت پر بڑی منصفانہ تنقید کی

ہے جس کا ثبوت یہ شعر ہے۔

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر است

یعنی کتاب " سرمایہ " کا یہودی مصنف کارل مارکس ایک ایسا پیغمبر ہے جس کے پاس وحی کی روشنی نہیں ۔ اس کا دل مومن ہے لیکن دماغ کافر ہے۔ دل اس لیے مومن ہے کہ وہ مزدور طبقہ کے ساتھ ہمدردی اور مساواتِ نسلِ انسانی کا علمبردار ہے ۔وہ ملوکیت، سرمایہ داری ، جاگیرداری ، اکتناز اور اجارہ داری سب کا دشمن ہے۔ یہاں تک اس کا فلسفہ اسلامی تعلیمات کے حق میں ہے کیونکہ اسلام بھی ان چیزوں کے خلاف ہے ۔

اس کے یہاں کا فرانہ عنصر یہ ہے کہ اس کا سارا فلسفہ " مساوات شکم" پر مبنی ہے اور وہ ہستی باری تعالیٰ کا منکر ہے ۔ کارل مارکس کی فطری کوتاہی یہ ہے کہ اس نے محض ' مساوات شکم ' کو طبقاتی نزاع اور سرمایہ و محنت کی کشمکش کا علاج سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ باتیں نہیں سمجھ سکا کہ مساوات اخوت پر موقوف ہے اور اخوت کا راز بنی آدم سے محبت میں پوشیدہ ہے۔ انقلاب یہ نہیں کہ مزدوروں کے دلوں میں سرمایہ داروں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے کیونکہ یہ ایک تخریبی جذبہ ہے۔ مارکس کا فلسفہ محض ایک مصنوعی وحدت کی بنیاد فراہم کرتا ہے لیکن طبقاتی یامعاشی امتیازات صرف اس صورت میں مٹ سکتے ہیں جب تمام افراد ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں ۔ یہ اخوت ایک روحانی اور پاکیزہ جذبہ ہے اور اس کا مقام شکم نہیں بلکہ دل ہے ۔ انسان کو محض ایک کماؤ حیوان سمجھ کر پھراس سے انسانیت ، ہمدردی اور ایثار کا مطالبہ کرنا بڑی مہمل بات ہے ۔ اشتراکیت صرف مادیت سے وابستہ ہے ۔ اس لیے وہ انسان کے لیے مفید نہیں کیونکہ انسان کی اصل مادہ نہیں روح ہے ۔

اخوت اور ایثار کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لیے جس مثبت بنیاد کی ضرورت ہے وہ

خدا کی ہستی کا اقرار ہے ۔ کارل مارکس کی دوسری خامی یہی ہے کہ اس نے اِلحاد کو اپنے فلسفہ کی بنیاد بنایا ہے ۔ حالانکہ زندگی نفیِ خدا سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی ۔ مارکس کہتا ہے کہ مساوات پیداوار کی صحیح تقسیم سے پیدا ہوسکتی ہے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے۔ مساوات صرف محبّت سے پیدا ہوسکتی ہے ۔ انسانوں سے وہی شخص محبت کرسکتا ہے جوانسانوں کے خالق سے محبت کرے ۔ اگر آپ خدا کے دشمن ہیں تو آپ کو کون مجبور کرسکتا ہے کہ آپ خلقِ خدا سے ہمدردانہ اور برادرانہ سلوک کریں ۔ اس لیے اشتراکیت کے علمبرداروں کو چاہیے کہ اگر وہ صحیح مساوات کو اپنانا چاہتے ہیں تو عقیدہ توحید کو اپنائیں کیونکہ یہی عقیدہ حریت ' اخوّت اور مساوات کی صحیح اور سچّی بنیاد ہے ۔

اس کے بعد علّامہ اقبال نے حضرتِ افغانی کی زبان سے ملوکیت پر اشتراکیت سے بھی زیادہ کڑی تنقید کی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ اشتراکیت کی طرح ملوکیت کا سینہ بھی بے نور ہے ۔ وہ بھی عملاً" انکار خدا پر مبنی ہے کیونکہ حکمرانی اور اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے ۔ کسی انسان کو انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں پہنچتا ۔ ملوکیت کی مثال یوں ہے جیسے شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس لیتی ہے اور پتے چھوڑ دیتی ہے ۔ بالکل اسی طرح ملوکیت بھی انسانوں کو جوہرِ انسانیت سے محروم کردیتی ہے ۔ انسان ویسے تو زندہ ہی رہتا ہے لیکن روحانی اعتبار سے فنا ہوجاتا ہے ۔

اشتراکیت اور ملوکیت دونوں روح کی دشمن ہیں ۔ دونوں خدا کی منکر ہیں اور بنی آدم کو فریب دیتی ہیں ۔ اشتراکیت کا مقصد خروج ہے یعنی مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف صف آرا کرنا اور منافرت پھیلانا جو خونریزی پر منتج ہوتا ہے ۔ ملوکیت کا مطمحِ نظر خراج ہے یعنی ملوک رعایا سے خراج وصول کرکے ذاتی عیش و عشرت پر صرف کرتے ہیں ۔ اشتراکیت علم ، دین اور فن کو ختم کردیتی ہے اور ملوکیت اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ وہ انسانوں کے جسم سے روح ہی نہیں بلکہ ان کے ہاتھوں سے روٹی بھی چھین لیتی ہے ۔ افغانی فرماتے ہیں کہ میں نے ان دونوں نظاموں کو مادہ پرستی میں

غرق دیکھا ہے ۔ لیکن مقصدِ حیات یہی نہیں کہ انسان حیوانوں کی طرح جیے اور مرجائے ۔ اس کے برعکس زندگی یہ ہے کہ اس میں سوز وساز پیدا ہو یعنی وہ عشقِ الٰہی کی آگ میں جلے اور اپنے آپ کو خدا کی رضا میں ڈھال دے ۔

وطنیت ' اشتراکیت اور ملوکیت کے معائب بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال حکیم افغانی سے کہتے ہیں کہ اسوقت اہلِ زمین کی کشتی کا کوئی ملّاح نہیں ۔ خدا معلوم عالمِ قرآن اسوقت کہاں ہے ۔ قرآن تو یہاں موجود ہے لیکن وہ معاشرہ کہاں ہے جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے ۔

افغانی فرماتے ہیں کہ وہ عالمِ قرآن ابھی تک ہمارے سینوں میں پوشیدہ ہے ۔ اور قُم کا منتظر ہے ۔ یعنی مسلمان چونکہ تعلیماتِ قرآنی سے بیگانہ ہو چکے ہیں اس لیے ابھی تک وہ عالم ظاہر نہیں ہو سکا ۔ اسکے بعد افغانی قرآنی حکومت کا خاکہ پیش کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ اگر قرآنی حکومت دنیا میں قائم ہو جائے تو اس میں خون ' رنگ ' وطن ' نسل اور ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا ۔ یہ حکومت ایسی ہو گی جس میں کوئی سلطان نہ ہوگا اور کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہیں ہوگا۔ اگر تم اس عالم کا تصوّر کرنا چاہو تو عہدِ فاروقی پر نظر ڈالو۔ حضرت عمرؓ کے دل پر اسی عالم کا فیضان جلوہ گر ہوا تھا۔ یہ عالم ایک لازوال حقیقت ہے ۔ اس مقدّس شجر پر نئے نئے برگ وبار رُونُما ہوتے رہتے ہیں ۔ یعنی قرآن کے بنیادی اصول تو اٹل ہیں اور قیامت تک ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق جزئیات کا استنباط ہو سکتا ہے ۔

اس کے بعد افغانی کی زبان سے علّامہ نے قرآنِ حکیم کے بنیادی تصوّرات بیان کیے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن دنیا میں کیسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے ۔ ان تصوّرات کو اقبال نے چار عنوانوں کے تحت بیان کیا ہے ۔ پہلا عنوان خلافتِ آدم ہے ۔

اس عنوان کے تحت علّامہ نے ' آدم ' کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں

کہ ساری کائنات میں ذاتِ حق کے سوا کوئی چیز موجود نہیں اور انسان اسی ذات حق کا مظہر ہے ۔ حقیقی انسان اس سیارے کی مانند ہے جو نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں یعنی اپنی ذات کے اعتبار سے زمان ومکان سے بالا ہے ۔ خدا نے اسے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ زمین پر اسکی نیابت کے فرائض انجام دے ۔ یہ کائنات اسی کے لیے بنائی گئی ہے۔ موت ' قبر اور حشر ونشر اس کی زندگی کے مقامات ہیں اور جنّت و دوزخ اس کے اعمال کے نتائج کا نام ہے ۔ وہ تمام کائنات کا سردار ہے۔ تمام اشیاء اور قوانین اسی کے لیے بنائے گئے ہیں۔ وہ بتدریج ان حقائق سے آگاہ ہو سکتا ہے جو اس کی نگاہوں سے مستور ہیں ۔ اسی کے وجود کے طفیل دیگر مخلوقات کی قدر ومنزلت بنی ہے ۔ اس کا دل غیر محدود وسعت کا حامل ہے ۔ اگر وہ نہ ہوتا تو سورج اور چاند کے خواص کون دریافت کرتا ؟ اس کی خلوت کی شان یہ ہے کہ فرشتے بھی وہاں بار نہیں پا سکتے ۔ اس لیے سچّی تہذیب یہ ہے کہ انسان کا احترام کیا جائے ۔ یعنی انسان کی عظمت کے اعتراف کے بغیر مساوات اور تہذیب کا دعویٰ کھوکھلا ہے ۔

زندگی دراصل یہ ہے کہ خدائے واحد کثرت کا تماشا کررہا ہے۔ مرد اور عورت کو اسلئے پیدا کیا گیا ہے کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ چلتا رہے ۔ عورت کا وظیفہ یہی ہے کہ وہ زندگی کی حرارت کو محفوظ کرتی ہے ۔ اسکی فطرت اسرارِ حیات کی حامل ہے۔ اگر وہ جذباتِ مادری کا اظہار نہ کرے تو نسلِ انسانی معدوم ہو جائے۔ وہ ایک ایسا شعلہ ہے جس سے شرار نکلتے ہیں ۔ اس کی عزّت میں ہماری عزت پوشیدہ ہے کیونکہ ہم اسی کی وجہ سے عالم وجود میں آتے ہیں ۔

اس کے بعد پردہ کا فلسفہ بیان ہوا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ جدید دَور نے تجھے دین کی خوبیوں سے بیگانہ کردیا ہے ۔ اسلئے میں تجھ کو بتایا ہوں کہ قرآن نے عورت کو پردہ کا حکم کیوں دیا ہے ؟ اسلیے کہ ذوقِ تخلیق ایک آگ ہے۔ اسی آگ سے اس دنیا کی رونق ہے ۔ اور اس آگ کی نگہبانی فرض ہے ۔ اگر عورت اس کی نگہبانی نہ کرے تو اس کا شعلہ تخلیق سرد پڑنے کا اندیشہ ہے ۔ اس جذبہ پر کسی اور جذبہ کا نقش نہیں

پڑنا چاہئے۔

مثال درکار ہو تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر غور کرو۔ جب آپؐ کے قلبِ مبارک میں تخلیقِ ملّت کا جذبہ کار فرما ہوا تو آپ نے تین سال سے زیادہ عرصہ تک غارِ حرا میں خلوت فرمائی اور اس دوران میں آپؐ نے اپنے سوا کسی غیر کو نہیں دیکھا۔ تب کہیں ملّتِ اسلامیہ کا نقش آپؐ کے دل پر قائم ہوا۔ مختصر یہ کہ کم آمیزی سے انسان کے تخیّل میں بڑی قوّتِ تخلیق پیدا ہو جاتی ہے۔ عورت اس دنیا میں تخلیقی فاعلیّت کا سب سے بڑا مظہر ہے لہٰذا اس کے لیے خلوت یعنی پردہ لازمی ہے۔

علم و عشق دونوں خلوت کے مقام ہیں۔ ارتقائے حیات کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ علم تحقیق سے لذّت پاتا ہے اور عشق تخلیق سے یعنی علم کا مقصد نامعلوم حقائق کی دریافت ہے اور عشق کا منصب ایجاد و اختراع۔ تحقیق کے لئے جلوت ضروری ہے اور تخلیق کے لیے خلوت۔ چونکہ خدا سب سے بڑا خالق ہے اسی لیے اسے سب سے بڑھ کر خلوت عزیز ہے یعنی پردے میں ہے۔

قرآنی عالم کا دوسرا رکن حکومتِ الٰہی ہے۔ کوئی انسان اس کائنات کا مالک نہیں اس لئے کسی انسان کو یہاں پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ حاکم صرف خدا کی ذات ہے۔ مسلمان انسانوں کی حکومت اور ان کے خود ساختہ قوانین کو تسلیم نہیں کرتا۔ حکومت الٰہی میں دین وسیاست جدا جدا نہیں ہیں۔ بندۂ مومن نہ کسی کو غلام بناتا ہے اور نہ کسی کا غلام بن کر رہ سکتا ہے۔ وہ خدائی قوانین کو اپنا رہنما بناتا ہے۔ اس کا معیارِ خیر و شر وہ ہے جو اللہ کا عطا کردہ ہے۔

قانون سازی کا حق خدا نے بندوں کو نہیں دیا۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ انسان کی عقل خود بیں اور خود غرض ہے۔ وہ صرف اپنا بھلا سوچتی ہے لیکن وحی کسی خاص طبقہ یا فرد کا مفاد نہیں دیکھتی بلکہ اس کی نگاہوں میں سب انسان برابر ہیں۔ صلح ہو یا جنگ، قانونِ الٰہی عدل پر مبنی ہے۔ اس قانون کی نظر میں شاہ و گدا برابر ہیں۔ جب انسان خود حاکم بن بیٹھتا ہے تو کمزوروں پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ آمریت یقینی طور پر

قاہریت کی صورت اختیار کرلیتی ہے ۔ جو انسان انسانوں پر حکمران ہوتا ہے وہ دراصل کافر ہے کیونکہ وہ اپنے طرزِ عمل سے خدائی کا دعویٰ کررہا ہے۔ ڈکٹیٹر کتنا ہی مدبر کیوں نہ ہو وہ اپنی مطلق العنانی کو پردے میں چھپا لیتا ہے۔ اسکی مجلسِ شوریٰ بھی دھوکے بازی ہے۔ آمریت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ دار زیادہ سرمایہ دار اور غریب زیادہ غریب ہوجاتا ہے ۔

علامہ کے نقطۂ نظر سے یورپ کا جمہوری نظام بھی افسوسناک ہے جس سے غریب طبقہ خوشحال ہونے کی بجائے اور بھی تباہ ہوگیا ہے۔ یہ وہ صُور ہے جس سے مردے زندہ ہونے کی بجائے اور بھی مردہ ہو گئے ہیں ۔ جمہوری حکومتیں دراصل شعبدہ بازوں کی جماعتیں ہیں جو کمزور قوموں کو مختلف بہانوں سے اپنا غلام بنالیتی ہیں اور باہمی رقابت کی بنا پر آپس میں لڑتی رہتی ہیں ۔

جمہوری نظام نے انسانوں کے اخلاق کو برباد کرڈالا ہے ۔ مردوں کا یہ حال ہے کہ انہیں ہوسِ زر نے گھیر رکھا ہے ' عورتیں فطری حدود سے تجاوز کررہی ہیں اور اولاد کو وبال سمجھ رہی ہیں۔ ضبطِ تولید پر عمل پیرا ہو کر ان کی حالت اس درخت کی سی ہے جس کی خواہش یہ ہو کہ اس پر کوئی پھل نہ لگے ۔ افسوس ہے اس قوم پر جو پھل کے خوف سے درختوں کی شادابی چھین لے۔ حیف ہے اس عورت پر جو یہ چاہتی ہو کہ اس کے ساز سے کوئی نغمہ نہ پھوٹے ۔ یورپ کی معاشرت بڑی چندھیا دینے والی ہے لیکن میں نے اس سے سوائے عبرت کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیا جائے ۔

اقبال کے نزدیک عالمِ قرآن کے مقدس دستور کی تیسری شق یہ ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ وطنیت اور ملوکیت کی طرح جاگیرداری اور زمینداری بھی خلافِ اسلام ہے کیونکہ یہ ملوکیت ہی کا ثمرِ تلخ ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں کہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ زمین شروع سے ہی جنگوں کا باعث بنی رہی ہے ۔ یہ ایک دلہن ہے لیکن اسکے

طلب گار تمام بنی آدم ہیں۔ حقیقت میں کوئی انسان اس کا مالک نہیں اسلیے کہ انسان تو مسافر ہے اور زمین اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے لہٰذا زمین اور انسان کا تعلق محکم اور استوار نہیں ہو سکتا۔ کسی کے پاس کروڑوں ایکڑ زمین کیوں نہ ہو ایک دن اس نے اسے چھوڑ جانا ہے۔ ہم اس سے اِستفادہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اس اعتبار سے یہ ہم سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں۔

یہاں پر علامہ زمیندار سے مخاطب ہو کر اسے ایک نکتے کی بات بتاتے ہیں جس میں قرآنی تعلیم کی روح پوشیدہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے زمیندار تو صرف اتنی زمین پر قبضہ کر کہ جب تک زندہ رہے تیری ضروریات کی کفیل ہو سکے اور مرنے کے بعد دفن ہونے کے لئے تجھے صرف دو گز زمین کی ضرورت ہے۔ یہ بہت کچھ ہے۔ لاکھوں ایکڑ پر قبضہ کر کے دوسروں کو رزق سے محروم کرنے کا کیا فائدہ؟ کہاں فنا پذیر مٹی اور کہاں جوہرِ انسانی! الارضُ للّٰہ کی آیہ مبارکہ بالکل واضح ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اصل میں زمین کا مالک خدا ہے جو شخص قرآن کی کسی چیز کا انکار کرے کافر ہے۔

اس مقام پر اقبال نے اس شبہ کا ازالہ کرنا بھی ضروری سمجھا ہے کہ یہ نظریہ زمین رُہبانیت نہیں سکھاتا۔ یہ ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ اِستفادہ کے لیے زمین کو دل کھول کر استعمال کرو۔ فضاؤں سے بھی شاہین کی طرح اِستفادہ کرنا چاہیے۔ دنیا بُری نہیں۔ اس کو نصب العین بنا لینا بُرا ہے۔ اِستفادہ اور پرستش میں بڑا فرق ہے۔ سونے چاندی اور اہل و عیال کی محبت میں غرق ہونے والا انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔ دل کے حریم میں صرف خدا کی محبت ہونی چاہئے۔ اسلامی فقر رُہبانیت اور لذّت کوشی کا نام نہیں بلکہ فقر تو سلطانی ہے یعنی دنیا کو حاصل کرنا اور اللہ کی خوشنودی کے لیے ترک کر دینا۔

اس دستور کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ حکمت خیرِ کثیر ہے۔ علامہ نے اس لفظ کو علم و دانش، فلسفہ و حکمت اور سائنس یعنی علم النفس و آفاق کے وسیع معنوں میں استعمال

گیا ہے ۔ یعنی علم و دانش ایک نعمتِ عظمیٰ ہے ۔ علم ہی کی بدولت انسان عناصر پر حکمران ہوتا ہے اس لیے حکمت کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرلیتا ہے۔ علم ہی کی بدولت ہم اشیائے کائنات کی ماہیت، مقصود اور قوانینِ فطرت کو سمجھ سکتے ہیں ۔ علم ہی کی بدولت انسان ایسے کارنامے انجام دیتا ہے جو بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد علامہ فرماتے ہیں کہ علم اسوقت مفید ہوگا اگر انسان اسے حق وصداقت کا مطیع بنائے رکھے بصورت دیگر یہی علم اس کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ علم اگر عشقِ الہٰی کے بغیر حاصل کیا جائے تو انسان کے حق میں شر بن جاتا ہے ۔ حکمتِ شیطانی کے باعث شہر اور صحرا بموں کے خوفناک دھماکوں اور بارود کے دھکے لاوے کی زد میں آ جاتے ہیں ۔ اسوقت یورپ کے سینہ میں جو آگ بھڑک رہی ہے وہ اسی ابلیسی علم کی سلگائی ہوئی ہے ۔ اسی منفی علم سے انسانیت بہیمیت کا شکار ہو کر مائل بہ انحطاط ہے ۔ قوموں کی توانائی جو مفید کاموں میں صرف ہو سکتی تھی ۔ تخریبی کارروائیوں میں صرف ہورہی ہے ۔

علامہ فرماتے ہیں کہ اگر عقلِ انسانی ادب خوردہِ دل نہ ہو تو جو قوت اسے حاصل ہوتی ہے وہ شیطان کی غلام بن جاتی ہے ۔ بے شک ابلیس کو ختم کرنا بڑا دشوار کام ہے کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے ۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اسے زندہ تو رہنے دیا جائے لیکن مسلمان کر لیا جائے۔ علم سے اقتدار حاصل ہوتا ہے لیکن خدا اس اقتدار سے بچائے جس میں محبتِ الہٰی کا رنگ نہ ہو۔ عشق کے بغیر انسان کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا ۔ محبّت کی روشنی کے بغیر علم نابینا رہتا ہے ۔ عقل محض بولہب ہے لیکن مسلمان ہو جائے تو علی مرتضیٰؓ ہے ۔

آخر میں جمال الدین افغانی اقبال سے کہتے ہیں کہ آج مشرق و مغرب کی قومیں پیچ وتاب میں مبتلا ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں اسرارِ کتاب سے بے خبر ہیں۔ روسی قوم اسوقت نیا تجربہ کررہی ہے جس کی رُو سے انسانوں کو روٹی تو مل جاتی ہے لیکن

دین ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ۔ میرا پیغام حق گوئی ہے اس لیے اے اقبال میری طرف سے یہ پیغام ملّتِ روسیہ کو پہنچا دے ۔

روحِ افغانی روسی انقلاب کا بھرپور جائزہ لیتی ہے جس نے سیاست اور معیشت کے نظام کو یکسر بدل ڈالا ہے ۔ وہ روسیوں کے سامنے اسلام کا مثبت نظریہ پیش کرتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے منفی کام تو خوب کیا ہے لیکن اس کا مثبت پہلو صرف اسلام ہی کے پاس ہے ۔ افغانی کہتے ہیں کہ اے ملّتِ روسیہ تم نے تو وہی کام کیا ہے جس کا نمونہ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں پیش کیا یعنی قیصریت اور ملوکیت کی بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ۔ لیکن تجھے مسلمانوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی ملوکیت کا شکار ہو جائے۔ دنیا کو ایک ایسی قوم کی ضرورت ہے جو انسانیت کو صرف خوفزدہ ہی نہ کرے بلکہ اپنے طرزِ عمل سے ایک بہتر مستقبل کی خوشخبری بھی دے ۔ تمہاری تقدیر اقوام مشرق سے وابستہ ہے کیونکہ مشرق کے پاس روحانیت کا عنصر موجود ہے ۔ تمہارے سینہ کا سوز نئے شب و روز پیدا کرسکتا ہے۔ مغربی دنیا کا دین و آئین فرسودہ ہوچکا ہے ۔ اگر تم نے اس کی پیروی کی تو تمہارا انجام بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہوگا ۔ تم نے مسلمانوں کی طرح انسانی خداؤں اور کہنہ بتوں کا کام تو تمام کردیا ہے ۔ اب لاالہ کے مرحلے کے بعد تمہاری منزل اِلّا اللّٰہ ہونی چاہیے۔ اگر نئے نظام کے لیے تمہیں کسی محکم بنیاد کی ضرورت ہے تو اپنے فکر کو قرآن مجید کی روشنی سے منوّر کرو۔ قرآن وہ انقلابی صحیفہ آسمانی ہے جس نے سیاہ فام حبشیوں کو روشن ضمیر بنا دیا اور نسل اور وطن کے امتیازات مٹا کر رکھ دیئے ۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے لا قیصر و کسریٰ کا نعرہ بلند کیا ۔ مغربی اقوام کی تمام سیاستِ ابلیسی مکروفن کی سیاست ہے ۔ ان کی اس چال کا مقصد دوسروں کو محروم اور محتاج بنانا اور اپنا توشہ خانے بھرنا ہے ۔ ضعیف اقوام پر دستِ تسلّط دراز کرنا شاہی نہیں بلکہ رُوباہی ہے ۔ قرآن جس فقر کی تعلیم دیتا ہے وہی اصل شہنشاہی ہے ۔ یہ فقر ذکر و فکر کے امتزاج کا نام ہے۔ فکرِ انسانی زیادہ تر بدن کی زندگی میں غرق رہتی ہے

لیکن ذکر دل کی زندگی ہے۔ ذکر دراصل ذوق و شوق کی تہذیب کا نام ہے جس کے بغیر فکرِ انسانی گمراہ ہو جاتی ہے۔ تم ابھی مادّی عقلیت میں اُلجھے ہوئے ہو اور بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ انسانی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ ایک طریقِ حیات نے فکر کو معزول کردیا اور دوسری طرف اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن نے ذکر و فکر دونوں کو باہم کردیا ہے۔

اے ملّتِ روسیہ! قرآن تو بورژوا طبقہ کی موت کا نام ہے۔ اس نے معاشی استحصال کی تمام راہوں کو مسدود کردیا ہے۔ اس نے سُود اور دولت کے دیگر تمام ناجائز طریقوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اسلام نے دولت کو ملکیت نہیں بلکہ امانت ٹھہرایا ہے۔

اسی طرح زمین بھی بنی آدم کے اِستفادہ کی چیز ہے۔ اسلام مسلمان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جان تک قربان کردے اور اپنی ضرورت سے زاید جو مال بھی اس کے پاس ہو اس کو اللہ کی مخلوق میں تقسیم کردے۔ مسلمان قرآن کی اس تعلیم سے بیگانہ ہو گیا اسی لئے آج اس کا ساغرِ مئے حیات سے خالی ہے۔

اے ملّتِ روسیہ! مَیں تمہیں صحیح اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اس سے تمہارے انقلاب کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اسلام تو سرمدی حقائق کا نام ہے۔ وہ ایسے حقائق ہیں جو روح میں ایسا انقلاب لاتے ہیں کہ پھر روح زمانہ بھر میں انقلاب برپا کرسکتی ہے۔ یہ ابدی حقائق کسی ایک قوم کا ورثہ نہیں ہیں۔ اگر مسلمان درسِ قرآن کو بھول جائیں تو اسلام کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ قرآن جن صداقتوں کو پیش کرتا ہے ان پر کسی خاص اُمّت کا اِجارہ نہیں۔ یہ صداقتیں زمان ومکان سے ماوریٰ ہیں۔ خود قرآن کا ارشاد ہے کہ اے مسلمانو اگر تم نے اس آئین کی پابندی نہ کی تو یہ بارِامانت کسی دوسرے کے حوالہ کردیا جائے گا۔

اے ملّتِ روس! اگر تو اس مقدّس دستورِ حیات کو مکمّل صورت میں اپنا لے تو اس دنیا کے جسم میں نئی زندگی کی روح پھونک سکتی ہے۔

آخر میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ مَیں اُس دن سے ڈرتا ہوں جب یہ امانت مسلمانوں سے چھین کر کسی اور قوم کے سپرد کردی جائے گی کیونکہ اِس دَور کا مسلمان

ع مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اکبرالہ آبادی

(از خواجہ محمّد زکریا)

خواجہ زکریا اپنی کتاب "اکبرالہ آبادی" کے ابتدایئے میں لکھتے ہیں:
"میرا مقصد بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ اکبر کو صحیح تناظر میں رکھ کر سمجھا اور سمجھایا جائے"

اس ہدف کے پیشِ نظر خواجہ صاحب نے اکبر کے عہد، انکی شخصیّت اور انکے کلام کا تاریخی، سیاسی، سماجی اور نفسیاتی جہتوں سے جو تجزیہ کیاہے وہ اردو ادب کے تحقیقی سرمائے میں ایک وقیع اضافہ ہے۔

خواجہ زکریا کو دکھ اس بات کا تھا کہ اکبرالہ آبادی جیسی عظیم شخصیّت نہ صرف تعصّبات کی دھند میں لپٹی ہوئی ہے بلکہ ناقدوں اور محقّقوں کے تحقیقی تساہل اور ادھورے اور یکرُخے مطالعے کے باعث اسکی صحیح پہچان کا حق ادانہیں ہوسکا۔اس مقام پر مجھے اصغر گونڈوی کا ایک شعریاد آرہا ہے

ے اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا

اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

سابقہ تحقیق میں اکبر کے ساتھ بعینہٖ یہی معاملہ ہوا کہ اکبر سے ملے لیکن اکبر کو نہیں دیکھا۔اسکے ظریفانہ لہجے میں سطح بینوں کو جو کچھ کچھ دکھائی دیا اسی کو انھوں نے سب کچھ سمجھ لیا۔خواجہ صاحب نے اسکے برعکس یہ کوشش کی ہے کہ اکبر کی ظرافت کے سطحی تاثر کے نیچے اسکی جو شخصیت دب کر رہ گئی ہے اسکو اجاگر کیا جائے اور حالات و واقعات کے تناظر میں اکبر کو پورے طور پر دیکھا جائے۔کتابیات کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اکبریات کی صحیح تفہیم کے لیے تقریباً ڈیڑھ سو کتب کا مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد تک رسائی حاصل کرنےکی حتی الامکان کوشش کی ہے اور اسکے کے بعد پورے دلائل اور شواہد کے ساتھ اس ایک ایک تعصب کا جائزہ لیا ہے جواکبر کے بارے میں روا رکھا گیا ہے۔

خواجہ صاحب نے اکبر کانہایت جامع مطالعہ کیا ہے اور اکبر کی تقریباً ساری حیثیتیں اس تحقیقی کاوش میں زیر بحث آگئی ہیں۔ اسکی زندگی کے مختلف ادوار، اسکی شادیاں ، ازدواجی اور خاندانی زندگی، اسکی شاعری کے مختلف رنگ،اسکی مختلف نوعیت کی ملازمتیں ،اکبر بحیثیت وکیل، جج، ریلوے کا ملازم، مترجم، مضمون نگار، مکتوب نگار، شاعر، زبان شناس، مفکر، بصیرت مند انسان، حکمت قرآنی سے بہرہ مند مسلمان، فرنگی استعمار کی گہری چالوں کا شناسا، فلسفے کا وسیع مطالعہ رکھنے والا، فرض شناس ماہرقانون اور موسیقی کارمزآشنا۔خواجہ صاحب نے ان سب پہلوؤں سے اکبر کی شخصیت کا جائزہ لیاہے حالانکہ اکبر نے منع کیا تھا کہ

میرے لائف لکھو ایّام جوانی کے سوا

خواجہ صاحب نے اکبر کی پوری تصویر دکھانے کے لیے اسکی کتابِ جوانی کے رنگین اوراق کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔

اکبر کے سالِ پیدائش کے سلسلے میں خواجہ صاحب نے بڑی تحقیقی کاوش کا ثبوت

دیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے حیاتِ اکبر کے مصنّفین کی ایک زبردست غلطی کا
سراغ لگایا ہے اور وہ یہ کہ اکبر کے سالِ ولادت کی عیسوی اور ہجری تاریخوں میں
مطابقت نہیں تھی اور اس سے پہلے اس اِشتباہ کی طرف کسی بھی مصنّف کی توجہ
نہیں ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب نے پورے دلائل اور شواہد سے یہ بات طے کردی ہے
کہ اکبر کا سالِ پیدائش شمسی تقویم کے حساب سے ۱۸۴۶ء نہیں بلکہ ۱۸۴۵ء ہے اور
قمری اعتبار سے ۱۲۶۱ ہجری ہے اور ماہِ ولادت شوال ہے۔چونکہ شوال کی قطعی تاریخ
معلوم نہیں ہو سکی اس لیے خواجہ صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ فی الحال صحیح عیسوی
تاریخ کا تعین ممکن نہیں ہے۔ بہر حال سالِ پیدائش کی صحت کا انکشاف حیاتِ اکبر کی
تحقیق و تدقیق کے سلسلے میں ایک گرانقدر پیشرفت ہے ۔اوراہلِ علم حضرات سے یہ
بات پوشیدہ نہیں کہ تحقیق میں ایک نکتے کا اضافہ بھی کتنی اہمیّت رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں خواجہ صاحب نے یہ بات بھی ثابت کی ہے کہ اکبر کی جائے
پیدائش نہ وہ بارہ ہے جہاں انکے چچا تحصیلدار تھے 'نہ وہ نوح ناروی والا نارہ' ہے اور
نہ ساداتِ بارہ کہ نسبت والا بار ہ ہے بلکہ یہ وہ قصبہ بارہ ہے جو الٰہ آباد سے بارہ میل
کے فاصلے پر ہے۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب نے حیاتِ اکبر کے مصنّفین کی آراء کا
بڑے استدلال کے ساتھ محاکمہ کیا ہے اور صحیح بات کی ٹوہ لگائی ہے۔ اسی طرح اکبر
کے سوانح نگاروں سے جہاں کہیں بھی کوئی کوتاہی ہوئی ہے' خواجہ صاحب نے اسکی
نشاندہی کی ہے اور صحیح بات بتائی ہے۔

اکبر پر جو مختلف الزامات عائد کیے جاتے ہیں خواجہ صاحب نے انکی تفصیل
اسطرح بیان کی ہے :-

"اس تنقید کی رُو سے اکبر ماضی کے اندھے مقلّد، مغرب کے بے بصر نقاد 'سائنس
اورجدید ترقّیات کے دشمن ،مغرب کی لائی ہوئی برکات کے مخالف، گہرے شعور سے
عاری اور زمانے کی رو کے خلاف چلنے والے تھے۔یہ الزامات بڑے سنگین ہیں۔ان
میں سے بعض باتیں تو صریحاً غلط الزام تراشی کی ذیل میں آتی ہیں اور بعض نیم

صداقتوں کے ضمن میں شمار کی جا سکتی ہیں اور یہ کون نہیں جانتا کہ نیم صداقت دروغ ے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔"

اکبر کے فرزند عشرت حسین اکبر کی انصاف پسندی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"حضرت قبلہ نے فرمایا کہ میرے سامنے شیطان پر بھی کوئی خاص الزام لگا کر پیش کیا جائے گا تو میں ضرور تحقیقات کروں گا اور شیطان کو شیطان جان کر خاص الزام کا مجرم قرار نہیں دوں گا"۔ اکبر کے مختلف عدالتی فیصلے اکبر کی اس عدل پسندی کی گواہی دیتے ہیں۔

خواجہ زکریا کو یہی تو شکایت ہے کہ ایک ایسا شخص جو کسی پر بھی غلط الزام برادشت نہیں کر سکتا اسکے بارے میں طرح طرح کی بے سروپا تہمتیں تراشی گئی ہیں۔

ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت میں برّصغیر کے پورے سیاسی اور سماجی پس منظر کا نہایت تفصیلی جائزہ لیا ہے۔مغربی اقوام کی یورش 'ولندیزیوں' پرتگیزیوں ' فرانسیسیوں اور بالخصوص انگریزوں کی یلغار کی جزئیات کا جائزہ لیکر بتایا ہے کہ فرنگی سوداگروں کی تجارت کس طرح رفتہ رفتہ بربریّت کی بھیانک صورت اختیار کر گئی۔گورے آقا نے اپنے سر پر تہذیب آموزی کی جو گٹھڑی اٹھا رکھی تھی اسکے اندر ایک وحشی چھپا بیٹھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے ظلم وجور کے کئی برسوں کے تسلسل کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔

اکبر نے اپنے بچپن میں الٰہ آباد کوانگریزوں کے ہاتھوں لٹتے ہوئے اور قتل وغارت کواپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"انداز ہ کیجئے کہ گیارہ سالہ اکبر پراس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔جو مستقلاً اس کے لاشعور میں انگریز دشمنی کی صورت میں باقی رہا"

اکبر اس سارے پس منظر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز کی ہر قسم کی پالیسی کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما تھا کہ یہاں کے باشندوں کو احساسِ کمتری کے ایسے انجکشن لگادیئے جائیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے غلامی پر رضا مند ہو جائیں اور

خواجہ صاحب کے بقول انگریز کی یہ چال اتنی کامیاب ہوئی کہ سرسید اپنی کتاب مسافرانِ لندن میں لکھتے ہیں:-

"تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو"

اکبر کو اسی مرعوبیت سے چڑ تھی۔ انہیں اپنی اقدار کی برتری کا شدّت سے احساس تھا۔ برِّصغیر میں جب یہ احساس اجتماعی طور پر بیدار ہوا تو اس نے آزادی خواہی اور احیاءِ اسلام کی مختلف تحریکوں کی صورت اختیار کی اور طلوعِ تصوّرِ خودی سے پہلے جس فرد کے ضمیر میں اس احساس کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا وہ اکبر الٰہ آبادی تھے۔

خواجہ صاحب کا موقف یہ ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ اکبر سہا ہوا تھا، اس کے برعکس سرسیّد خوفزدہ تھے۔ انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں ۱۸۵۷ء جیسا واقعہ پھر رونما نہ ہو جائے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریز کو بھی یہی خوف تھا۔ سرسیّد یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب انگریز یہاں سے کبھی نہیں جائے گا اور اس کا اظہار انہوں نے کئی مواقع پر کیا تھا۔ حالی کی 'حیاتِ جاوید' میں یہ حوالہ موجود ہے:

"سرسیّد نے قسم دے کر نواب سے کہا مَیں صرف تمہاری خیرخواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادے کو دل سے نکال دیں۔ انگریز کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔"

اسی لیے سرسیّد کے یہاں انگریز سے مفاہمت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا وہ نیک نیّتی سے ایسا سمجھتے تھے۔ لیکن اکبر کی نظر میں اس پالیسی کے دوررس اثرات تھے۔ جمال الدین افغانی کے خیالات نے اکبر کو اس لیے متاثر کیا کہ افغانی سرسیّد کی اس روش کو مسلمانوں کے حق میں زہرِقاتل سمجھتے تھے۔

خواجہ زکریا، اکبر کے فکری پس منظر کی وضاحت کرتے ہُوئے یورپی اقوام کی چیرہ دستیوں سے لے کر تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ عدمِ تعاون اور تحریکِ خلافت تک برّصغیر کی تمام تحریکوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ حالات تھے جو اکبر کا ذہن تیار کر رہے تھے۔ اکبر مزاجاً تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ قوموں کے عروج و زوال پر انہوں نے غور کیا تھا۔ ان کا دور عالمِ اسلام کے ہمہ جہتی زوال کا دور تھا۔ مغربی ممالک عالمِ اسلام پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ اکبر اپنی بصیرت کی بنیاد پر تاریخ اور سیاست کے تیزی سے بدلتے ہوئے واقعات سے صحیح نتیجے اخذ کرتے چلے گئے۔ وہ تاریخی واقعات کو رونما ہوتا دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کی طاقت اور حکمتِ عملی کا انہیں پُورا اندازہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو زوال کے گڑھے سے نکالنے کے لئے جو لائحہِ عمل سرسیّد نے اختیار کیا ہے وہ بھی نامناسب ہے کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو عارضی فائدہ پہنچے گا مگر بالآخر نقصان ہو گا۔"

اس باب کے آخر میں خواجہ زکریا نہایت فاضلانہ تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:۔

"اکبر، جمال الدین افغانی کی طرح عالمِ اسلام کے حالات کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھتے تھے۔ ان پر یہ واضح تھا کہ یہ سب کچھ مغربی سامراج کا کیا دھرا ہے لیکن اس کے برخلاف سرسیّد احمد خان ہندوستان کو دوسرے اسلامی ممالک سے الگ کر کے دیکھتے تھے اور اسلامی اخوّت کے تصوّر کو قبول نہیں کر رہے تھے"۔

سرسیّد کی انگریز دوستی کے اثرات بھی اکبر کی نظر میں تھے۔ گویا اکبر کی دوراندیشی کا زمانی اور مکانی پھیلاؤ سرسید کی سوچ سے زیادہ وسیع اور پہناور تھا اور حالاتِ مابعد نے اکبر کی صحتِ فکر کی گواہی دی ہے۔

اکبر انگریز کی نیّت اور ذہنیت کو سرسیّد سے زیادہ سمجھتے تھے البتّہ یہ بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ ہندو کی ذہنیت اور نیّت سے سرسیّد اکبر سے پہلے واقف ہو چکے تھے۔

'اکبر کے افکار' کے عنوان سے خواجہ صاحب نے اکبر کے بارے میں پھیلی ہوئی اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کے سلسلے میں بڑی تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے۔ خواجہ صاحب نے تسلیم کیا ہے کہ چونکہ شاعرانہ پیرایہ اظہار منطقی نہیں ہوتا اس لئے کسی مفکر شاعر کے خیالات کے بارے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اکبر نے ظریفانہ پیرایہ اظہار کو اختیار کیا ہے اور ایسے لہجے کو سطحی انداز سے دیکھنے سے غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کی اور بھی زیادہ گنجائش نکل آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کے خیالات کا ایک حصہ منفی ہے اور دوسرا مثبت اس لیے کہ تعمیر کے لیے تخریب کا عمل ضروری ہے۔ منفی حصے میں اکبر نے تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات پر طنز کیا ہے اور مثبت حصے میں انہوں نے بعض مٹتی ہوئی اقدار کے احیاء کی کوشش کی ہے۔ اکبر نے مغربی فلسفہ اور سائنس کی ایسی کورانہ تقلید پر حملہ کروار کیا ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کے مفہوم کو دانش مغرب کے مطابق ڈھالنے کی نوبت پہنچ گئی تھی۔ اکبر احساس کمتری کا شکار نہیں تھے بلکہ احساس کمتری کا شکار وہ لوگ تھے جو دانشِ مغرب کو حرف آخر سمجھ بیٹھے تھے۔ اس کے برعکس اکبر کو یقین کامل تھا کہ سائنس کے نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور علمی انکشافات کی دنیا میں کوئی چیز بھی حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ خواجہ صاحب نے اکبر کے بے شمار اشعار کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اکبر سائنسی ترقیوں کے مخالف ہرگز نہیں تھے بلکہ وہ تو اس بات پر زور دیتے تھے کہ جدید تعلیم حاصل کرنی ہے تو سائنسی، صنعتی اور تکنیکی تعلیم حاصل کریں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے

خواجہ صاحب نے پورے اعداد و شمار کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ انگریز کی تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ اس برِصغیر کو سائنس، زراعت، صنعت، حرفت، طب اور انجینئری کی تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ انگریز کو احساس تھا کہ ہندوستان انیسویں صدی کے آغاز تک صنعت و حرفت میں انگلستان سے بڑھا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے پوری کوشش کی کہ یہ صرف ایک زرعی ملک بن کر رہ جائے اور یہاں سے انگلستان کے کارخانوں کے لیے خام مال دستیاب ہوتا رہے۔

اکبر انگریز کی اس پالیسی کو گہری تشویش کی نظر سے دیکھتے تھے جو برِصغیر میں صنعت و حرفت کی بربادی کا باعث بنی تھی۔ علی گڑھ میں جو تعلیم دی جا رہی تھی اکبر اس سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے کہ اس میں سارا زور آرٹس کے مضامین اور کھیلوں پر دیا جاتا تھا اور ایسی تعلیم دی جا رہی تھی جس سے ذہن تبدیل ہو کر اپنی تہذیب کے باغی ہو جائیں ۔اس کے برعکس اکبر یہ تقاضا کرتے تھے۔

علم پُورا اگر سکھائیں ہمیں
تب کریں شُکر مہربانی کا

اکبر ریل کی ایجاد کے ہرگز مخالف نہیں تھے ۔وہ تو اس سُوءِ نیت کے مخالف تھے جس کی بنیاد پر اس برِصغیر میں ۱۸۷۲ء تک چھ ہزار میل لمبی ریلوے لائن بچھا دی گئی تھی۔ انگریز کو ہماری خیرخواہی عزیز نہیں تھی۔ وہ تو ریل کی پٹڑی کا جال اس لیے بچھا رہا تھا کہ یہاں سے خام مال بآسانی ملک کی بندرگاہوں تک منتقل کیا جاسکتا تھا اور دورانِ جنگ فوج اور اسلحہ کو لے جانے میں آسانی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس وسیلے سے ملک کے اندر باغی عناصر کو بڑی تیزی سے دبایا جاسکتا تھا۔

اسی انداز میں خواجہ صاحب نے تاریخی اسناد و شواہد کے ساتھ انگریزی حکومت اور مغلیہ دَورِ حکومت کے اقتصادی اور مالیاتی نظام کے موازنے سے وہ حقائق پیش کیے ہیں جن سے انگریز کے دور کی نام نہاد خوشحالی کی قلعی کھُل جاتی ہے۔ انگریز نے یہاں پر انتظامی، عدالتی، معاشرتی اور پولیس کے نظام کو اس نہج پر استوار کیا جس کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو محکومی کی ذلّت کا زیادہ سے زیادہ احساس دلایا جائے۔ اکبر خود اس انتظامی مشینری سے متعلق تھے اس لیے انھوں نے اس کے مقاصد کا نہایت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

افکارِ اکبر کے موضوع پر خواجہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اکبر کو انگریز کی ہواخواہی سے جو نفرت تھی اس کے پس منظر میں ٹھوس تاریخی حقائق تھے۔ مختصر یہ کہ ہم انگریز کے کتنے ہی خیرخواہ بن جائیں انگریز ہمارا خیرخواہ ہرگز نہیں تھا۔ اس کو صرف اور صرف اپنا مفاد عزیز تھا اور یہ حصولِ مفاد یہاں کے باشندوں کے استحصال کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اکبر اس استحصال کی ساری صورتوں سے پوری آگاہی رکھتے تھے۔ قرآن کی عقلی توجیہیں اور تاویلیں ان کے لیے وہی حیثیت رکھتی تھیں جیسی ایک زمانے میں یونانی فلسفے سے مرعوب ہو کر کی گئی تھیں۔ اکبر فرنگی یلغار کو قرآنِ مجید کی اس آیت کی روشنی میں دیکھ رہے تھے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝ (النمل۔ ۳۴)

یعنی حکمران جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزّت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔

انہی حقائق کے پیشِ نظر فرنگی کی نقالی اکبر کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اسی رویہ کے خلاف ان کی صدائے احتجاج کا لہجہ طنز سے بھرپور ہے۔ اس تردیدی اور احتجاجی لہجے کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب نے اکبر کا مثبت پہلو بھی پیش کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی ترقیاں مذہب اور اخلاق کے زیرِ سایہ ہونی چاہئیں ورنہ انفرادی

نفع اندوزی کا عفریت معاشرے پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اکبر نے ان خیالات کا اظہار بھی کیا ہے کہ طاقت کے بغیر عزّت اور آزادی کا حصول ناممکن ہے۔

زبانیں خوب کھلتی ہیں مگر قسمت نہیں کھلتی

سبب یہ ہے کہ اُٹھتا ہے قلم ہاتھ اُٹھ نہیں سکتا

اکبر اس استحصال کے خلاف مصالحت نہیں بلکہ مقاومت چاہتے تھے اور یہی وہ نکتہ ہے جو اکبر اور سرسیّد کے ذہنی فاصلوں کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اس بات میں اکبر کے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے جو اکبر کی مثبت فکر کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جسے دوسرے نقادوں نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اکبر فکری افراط و تفریط سے سخت بیزار تھے۔ جامد ماضی پرستی اور مغرب کی کورانہ نقالی دونوں رویّے ان کے نزدیک قابلِ مذمّت ہیں۔ انھوں نے مولوی اور مسٹر دونوں کو ہدف بنایا ہے۔

سچ یہ ہے کہ واعظ مجھے بھاتا ہے نہ مسٹر

وہ خبط ہی اچھا نہ یہ شوریدہ سری خوب

خواجہ صاحب لکھتے ہیں: "اس موضوع کے تواتر اور تسلسل کی وجہ سے اکبر کو قدیم تہذیب کا مقلّد، بے بصر اور رجعت پسند قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں قدیم تہذیب کی مذمّت کم اور جدید کی زیادہ ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس دور کو خطرہ قدامت پسندی سے نہیں تھا جدّت پرستی سے تھا۔"

"شاعری کے اسالیب" کے عنوان سے خواجہ صاحب نے اکبر کی شعری انفرادیت کا سراغ لگایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ایک فنکار کی حیثیت سے اکبر اسی طرح ایک منفرد اور اپنی پہچان رکھنے والا شاعر ہے جس طرح میر، نظیر، انیس، غالب اور اقبال جیسے مشاہیر شعراء ہیں۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب نے دکنی دَور سے اکبر تک کے دَور کی اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت کی تفصیل بیان کی ہے اور یہ دریافت بھی کی ہے کہ اکبر 'اَودھ پنچ' کی اشاعت کے زمانے سے مزاحیہ شاعری کی طرف مائل رہے

ہیں ورنہ ۱۸۷۷ء سے پہلے ان کی شاعری طنزومزاح سے دور تھی۔

اکبر سے پہلے اردو شاعری میں معاشرتی ہجونگاری محض اتّفاقیہ طور پر موجود تھی ورنہ زیادہ تر اس کا رُخ افراد کی طرف تھا۔ اکبر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو شعوری طور پر کسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔

خواجہ صاحب نے اس باب میں اُردو میں طنز و مزاح کی مختلف صورتوں کے اظہار کے لیے جو متعدّد اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں انکے مفہوم کی وضاحت کی ہے اور مثالوں کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اکبر نے ان جملہ صورتوں کااستعمال اپنے کلام میں کہاں کہاں کیا ہے۔ یعنی اکبر کے ہاں کہاں پر طنز ہے' تعریض ہے' مذمّت ہے، ہجو ہے' تحریف ہے' تنقیص ہے 'خوش طبعی ہے اور کہاں پر اکبر کی اندرونی تلخی اور حرارت سے الفاظ پگھل پگھل جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس بحث میں طنز کی انتہائی عمدہ تعریف یہ کی ہے :۔

" طنز ایسی تخریب ہے جواشد ضروری ہے ۔یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح عمل جرّاحی اور لرزتی ہوئی دیوار کا اِنہدام ہے ۔ ظاہر ہے یہ تخریبی عمل نہ کیے جائیں تو موادِفاسد مریض کو ہلاک کردے گا اور لرزتی ہوئی دیوار خطرہ جان بن جائے گی۔"

خواجہ صاحب کے تجزیے کے مطابق اکبر ظریف نہیں طنّاز ہیں اور یہ بھی صحیح لکھا ہے کہ خالص ظرافت صرف نظیر اکبر آبادی کے یہاں ہے اور خالص طنز صرف اکبر الٰہ آبادی کے ہاں۔

مکالماتی انداز،لفظی اور واقعاتی مزاح کے علاوہ مزاح کے کئی دیگر اسالیب بھی بڑی تعداد میں اکبر کے یہاں موجود ہیں اور اس نے صنعت ایہام سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ خواجہ صاحب نے اکبر کے یہاں مزاح کے مختلف پیرایہ ہائے اظہار کی دریافت کے سلسلے میں بڑی محنت سے اکبر کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

خواجہ صاحب نے اکبر کی امیجری پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اس ضمن میں اکبر کے اجتہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ہماری پوری شاعری پر غزل کے اسلوب کی مہر مثبت ہو چکی تھی جوامیجری کی کسی تبدیلی کو بہت کم گوارا کرتی ہے مگر اکبر الہ آبادی واحد شاعر ہیں جن کی شاعری کا مطالعہ انکے دور کی ہمہ جہتی تبدیلیوں کا مکمل شعور بخشتا ہے۔ اسکے علاوہ خواجہ صاحب نے اکبر کے یہاں ذخیرہ الفاظ کی وسعت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کے الفاظ کے استعمال میں انھوں نے غیر معمولی اجتہاد سے کام لیا ہے۔ انکی کارگاہ سخن میں کوئی لفظ غریب اور مبتذل قرار نہیں پاتا۔"

اکبر نے جن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی ہے خواجہ صاحب نے ان کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا اور عہد بہ عہد اکبر کے یہاں ان اصناف میں جو فنّی اور فکری تبدیلیاں آئی ہیں ان کا ارتقائی مطالعہ کیااور ہر صنف میں اکبر کی انفرادیت واضح کی ہے۔

اس کے علاوہ پوری تدقیق کے ساتھ خواجہ حیدر علی آتش تک اکبر کے سلسلہ تلمّذ کی صحیح دریافت کرنے کے بعد اکبر کے استاد منشی وحید کے اثرات کی اکبر کی شاعری میں نشاندہی کی گئی ہے یہ باب اس اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ خواجہ صاحب نے زیرِ بحث اصنافِ سخن کے ارتقا کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اکبر کی غیر مقفیٰ نظموں کا تذکرہ بھی آیا ہے کہ اکبر نے اسوقت غیر مقفیٰ نظمیں لکھیں جب انہیں بدعت تصور کیا جاتا تھا۔اکبر پر جوبے جواز اعتراضات کیے گئے ہیں انکی تردید ساری کتاب میں خواجہ صاحب کے پیش نظر رہی ہے ۔اس باب کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:۔

" جو نقاد اکبر کو قدامت پسند شاعر ثابت کرنے پر زورِ قلم صرف کرتے ہیں انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کوئی قدامت پسند شخص اسالیب اور اصناف میں روایت سے بغاوت نہیں کر سکتا۔اگر اکبر نے اصنافِ سخن میں نت نئے تجربات سے جھجک محسوس نہیں کی تو وہ نئے خیالات کے قبول کرنے میں کس طرح رجعت پسند ہوسکتے تھے"

نظم نگاری میں اکبر کی انفرادیت کو واضح کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے علامہ اقبال،نظیر اکبر آبادی اور اکبر کا بہت دلچسپ اور خیال انگیز موازنہ کیا ہے:۔

"نظیرؔ کے ہاں تنوّع ہے مگر فن سے بڑی لاپروائی برتی گئی ہے"
"اقبالؔ کے ہاں تنوّع کم ہے مگر فنّی اہتمام کمال پر ہے"
"اور اکبرؔ کے ہاں تنوّع بھی ہے اور فنّی اہتمام بھی"

آخری باب اکبر کی نثرنگاری سے متعلق ہے اور اس میں اکبر کے مکاتیب' ترجمے اور مضامین زیر بحث آئے ہیں۔ اکبر کے مضامین انکے نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتے ہیں اور انکے مکاتیب سے انکے شخصی تعلقات اور کلام کے جو بہت سے گوشے واضح ہوتے ہیں خواجہ صاحب نے ان کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور اکبر کے نثری اسلوب کی جملہ خصوصیات بیان کی ہیں۔اس سے پہلے نقادوں نے اکبر کی نثر کو زیادہ درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ خواجہ صاحب کا یہ کارنامہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے اکبر کی نثر کا جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اس جائزے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی اکبر کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

خواجہ صاحب نے اکبر الہ آبادی کے احوالِ زندگی' انکے افکار اور اسالیب فن کی تحقیق کے سلسلے میں جس محنت اور کنج کاوی کا ثبوت دیا ہے اور ہر مسئلے کو جس علمی دیانت اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے اسکی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ بلاشبہ یہ ایک گراں قدر تحقیقی کارنامہ ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے thesis کو اتنے مدلّل انداز میں پیش کیا ہے کہ اس سے بنیادی اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش دکھائی نہیں دیتی۔ خواجہ صاحب کی تحقیق سے جو بات نہایت وضاحت کے ساتھ سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ اکبر غیرت قومی اور حمیت ملّی کا نام ہے اور اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ فکری طور پر اکبر' اقبال کا پیش رو ہے اور اقبال' اکبر کی پیش رفت ہے۔وہی اقبال جو اکبر کو خطاب کرتے ہوئے پیرومرشد کہتا ہے اور جس نے اس کے مزاحیہ اسلوب کے پیچھے آنسوؤں کی جھالروں کو دیکھ لیا تھا۔ اکبر بنیادی طور پر ایک دردمند مسلمان ہے۔ خواجہ زکریا نے اکبر شناسی کو اپنا موضوع قرار دیا ہے تو یہ حسنِ انتخاب خواجہ صاحب کی اپنی دردمندی کی علامت بھی ہے۔میں خواجہ صاحب کو اس تنقیدی 'تحقیقی' ادبی

اور قومی کارنامے پر مبارک پیش کرتا ہوں اور اپنا ایک شعر بھی انکی نذر کرتا ہوں :

اکبرؔ کو وہی لوگ سمجھ پائیں گے انورؔ
خواجہ کے حوالے سے جو اکبرؔ سے ملیں گے

یہاں خواجہ سے میری مراد خواجہ حسن نظامی نہیں بلکہ------ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ہیں۔

کاروانِ حرم

(ع۔ س۔ مسلم کا ایک امتیازی کارنامہ)

میں اپنی اس بے خبری کے اعتراف سے اس مضمون کا آغاز کرتا ہوں کہ جب مجھے پہلی دفعہ دوبئی اور شارجہ جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت میں ع۔س۔مسلم کے نام سے واقف نہیں تھا۔ مسلم صاحب بھی ان دنوں دوبئی میں موجود نہیں تھے۔ میرے سبھی دوست اور احباب بالخصوص عطاء الحق قاسمی صاحب اس دورانِ قیام میں مسلم صاحب کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے رہے۔ ان کی اس گفتگو سے مسلسل یہ احساس ہوتا رہا کہ 'جائے مسلم خالی است' مجھے اپنی اس کم سعادتی کا بہت ملال تھا اور دل میں یہ حسرت رہ گئی کہ اے کاش مسلم صاحب سے ملاقات ہو گئی ہوتی!

پچھلے برس ایک مشاعرے میں شرکت کے سلسلے میں دوبارہ دوبئی جانے کا اتفّاق ہوا تو مسلم صاحب ہم سب دوستوں کو ملنے کے لیے ہماری جائے قیام پر خود تشریف لے آئے۔ہمارا پروگرام بہت TIGHT تھا۔بقول ظفر اقبال۔ کہ چل چلاؤ ہے اور مختصر ہی ممکن ہے۔یہ کوئی بھرپور ملاقات نہیں تھی۔ملاقات کاایک جھونکا سا تھا۔ لیکن اس کا معطّر سا تاثّر ابھی تک باقی ہے۔پھر ہوا یوں کہ مسلم صاحب نے بڑے خلوص اور محبّت کے ساتھ ' کاروان حرم' کا ایک نسخہ مجھے ارسال کیا۔

اس نسخے کے توسّط سے مسلم صاحب سے جو ملاقات ہوئی ہے وہ بہت جامع اور بڑی بھرپور ہے۔ اس کتاب پر احمد ندیم قاسمی صاحب کے تبصرے کو پڑھ کر مجھے اپنی ایک اور بے خبری کی خبر ہوئی کہ مسلم صاحب ایک افسانہ نویس بھی ہیں "ایک غزل گو بھی اور ایک گیت نگار بھی۔ اس سے پہلے مجھے ان کی شخصیت کی اس پہلوداری سے آگاہی نہیں تھی۔'کاروانِ حرم' کے مطالعے سے بخوبی اندزاہ کیا جاسکتاہے کہ وہ ان میدانوں میں بھی یقیناً" صاحب طرز ہونگے۔

حمد و نعت پر مشتمل ان کا ایک الگ مجموعہ شعر بھی ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکاہے۔ مظفر وارثی 'حافظ لدھیانوی اور حفیظ تائب ــــــــان تینوں نے غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور جب سے نذرانہ سخن لیکر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے ہیں پھر کوچہ غزل میں قدم نہیں رکھا ـــــ سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کرــــــ ع ۔ س ۔ مسلم نے بھی ۱۹۸۴ کے بعد ۱۹۸۷ء میں ' کاروانِ حرم' کے نام سے حمد و نعت کا ایک اور دلنشیں مرقّع ترتیب دیاہے جو ان کے سفرِ حج کی ایک ایسی رُوداد ہے اُردو شاعری میں جس کی مثال موجود نہیں ہے۔مجھے اسی کتاب کے بارے میں چند باتیں عرض کرنی تھی۔

حمدِ باری تعالیٰ اور نعتِ پیغمبر علیہ الصلوٰۃُ والتسلیمات پر کسی کا مامور ہو جانا بڑی

عبادت ہے۔ صوفی افضل فقیر نے بہت درست کہا ہے۔

کیا فکر کی جولانی کیا عرضِ ہنر مندی
توصیفِ پیمبرؐ ہے توفیقِ خداوندی

"کاروان حرم" ایک ایسے مسافر حرم کا جسمانی، روحانی اور قلبی سفر ہے جس کا زادِ سفر عجز و نیاز، عشق و محبّت، احساسِ ندامت اور عرقِ انفعال ہے۔

حرم ہے کہ محشر کا میدان ہے
مرا منہ ہے، میرا گریبان ہے۔

یہ مجموعہ شعر حمد بھی ہے اور مناجات بھی، آشوب ذات بھی ہے اور ملّت کی اجتماعی زبوں حالی کا درد انگیز تذکرہ بھی اور مقاماتِ مقدّسہ کی زیارت سے دل پر وارد ہونے والی کیفیات کا بیان بھی۔ اس کتاب کے دامن میں فریاد و فغاں بھی ہے اور تاریخی واقعات کی بولتی ہوئی تصویریں بھی۔ یہ نظم رحمتِ یزداں کے حضور میں پوری اُمّت کا پھیلا ہوا دست دعا بھی ہے اور اس منظوم داستانِ سفر حرم میں سب سے زیادہ نمایاں چیز سیرتِ رسولؐ پاک کی تجلّیوں کا تذکرہ ہے۔ اس ضمن میں مسلم صاحب کا یہ نعتیہ صحیح ہے کہ محمدؐ ہمارا مدارِ سفر۔۔۔۔حفیظ تائب "کاروان حرم" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات، صفات اور تعلیمات کے مدار میں گردش کرتے ابوالامتیاز کا فکر کچھ ایسے منوّر و معنبر ہُوا ہے کہ لفظ لو دینے لگے ہیں تو مطالب کی خوشبو دل و دماغ کی گرہیں کھولنے لگی ہے۔اس طرح ایک نہایت وقیع و رفیع نعت ظہور پذیر ہوئی ہے"

ڈاکٹر عبداللہ عبّاس النّدوی رقم طراز ہیں۔

"مسلم صاحب کی فکر قدسی الاصل ہے۔ ان کا موضوع آسمان کی رفعتوں سے بلند، زمین کی پہنائیوں سے وسیع، دریاؤں کے بہاؤ سے زیادہ سخی اور آفتاب مہتاب کی روشنی سے زیادہ تابناک ہے۔یعنی ان کا موضوع سخن محسنِ انسانیت،فخرِ دُودمانِ بشریت، آبروئے دوسرا، صدرِ جریدہ ِانبیاء محمّد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے"

جناب احمد ندیم قاسمی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مسلم صاحب کے پہلے مجموعہ حمد و نعت کے مطالعے سے اہل الرّائے اصحاب نے مسلم صاحب کی حمد نگاری اور نعت گوئی سے جو بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں وہ کاروانِ حرم میں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہیں کہ حرمین شریفین کے سفر کی اس روحانی اور وجدانی روداد میں تمام مطلوبہ خوبیاں بدرجہ اَتم موجود ہیں اور اُردو نعت نگاری کے نئے در وا ہوتے محسوس ہوئے ہیں"

اتنی وقیع آراء کے بعد میرے لئے بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ میں کچھ عرض کروں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلم صاحب کی شاعرانہ استعداد انتہائی قابل توجہ ہے۔میرے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے کہ مسلم صاحب کے سامنے اس ضمن میں مسدّسِ حالی کا نمونہ موجود تھا۔اس کے باوجود انھوں نے مسدس کے بجائے مثمن کی ہیئت کو اپنا کر فنی طور پر ایک دشوار راستہ کیوں اختیار کیا ہے؟ چار ہم قافیہ مصرعوں کے بجائے انھوں نے چھ ہم قافیہ مصرعوں کی تلاش کا اہتمام کیا ہے تو آخر کس لئے ؟ مسلم صاحب کے جذبہِ حُبِ رسولؐ نے مجھے اس سوال کا یہی جواب دیا ہے کہ ـــــــــ لذید بود حکایت درازتر گفتم ــ اور اقبال کے الفاظ میں انھوں نے یہ راہِ دراز اس لیے اختیار کی ہے کہ

من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

حقیقت یہ ہے کہ مسلم صاحب کے جذب و شوق ،والہانہ پن ،شیفتگی اور آرزو مندی نے اس راستے کے ہر مرحلے کو ان کے لیے انتہائی آسان کر دیا ہے اور بڑے بڑے پتّھر ان کے لئے پانی ہو کر رہ گئے ہیں ۔ قوافی کی دشواری اور پانی کا ذکر آیا ہے تو چشمہ زمزم کے بارے میں اس مثمّن کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے۔

یہ آبِ صفا، چشمۂ سلسبیل
یہ زمزم کہ جنّت کی ہے زنجبیل
طفیلِ کفِ پائے ابنِ خلیل
شفائے تن و روحِ جانِ علیل
دلیلِ الٰہ قوّی و جلیل
ہزاروں برس سے لگی ہے سبیل
ابد تک جہاں میں ہے معجز نشاں
زمیں پر یہی کوثرِ تشنگاں

اور جس مقام سے چشمۂ زمزم پھوٹا تھا ذرا اس کا منظر بھی دیکھئے ۔

درختوں کا سایہ نہ جھاڑی کی آڑ
بھیانک ،یہ ،دیو قامت پہاڑ
بلا خیز تپیں کھائیاں، کھڈ، دراڑ
زمیں بانجھ، بنجر، بیاباں اجاڑ
نہ پانی کا قطرہ نہ رُکھ ہے نہ جھاڑ
تپش ہے کہ آتش میں بُھنتا ہے بھاڑ

رضا ہے مگر جزوِ روح و بدن
نہیں ہاجرہ کی جبیں پر شکن

خانہ کعبہ کے تقدس اور عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے مسلم کے پیرایہ بیان میں قوافی کاالتزام دیکھئے۔

حریمِ ازل ہے یہ بیتِ عتیق
جبینِ عرب پر درخشاں عقیق
ازل تا ابد رحمتوں میں غریق
حقیقت کی منزل کا روشن طریق
الٰہی نہیں کوئی تجھ سا شفیق
تو ہی میرا والی ہے تو ہی رفیق
[illegible] شرک و شقاق
مٹا کجروی کا سیاق و سباق

اس ضمن میں ایک اور اقتباس کا حوالہ بہت ضروری ہے جس میں ردیف اور قافیہ مصرعوں کے آغاز میں آگئے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ ایک بہت ہی نادر تجربہ ہے۔

وہی منبعِ خوبیِ جاوداں
وہی مجمعِ حسنِ خلقِ جہاں
وہی مرجعِ خستگانِ ماندگاں
وہی مطمعِ قلبِ صاحب دلاں
وہی مطلعِ انوارِ [illegible]
وہی مقطعِ ظلمِ [illegible]

وہ موضوعِ آغاز و انجام ہے
وہ اتمامِ انعام و اکرام ہے

مسلم صاحب کی شاعری کے تیوروں میں ان کا زور بیان اور جوشِ کلام انتہائی قابلِ ذکر ہے اور مولانا حالی کے بقول بھی یہ صفت شاعری کی بنیادی صفات میں سے ہے۔مجھے یہ نظم ایک پہاڑی ندّی کی طرح محسوس ہوتی ہے جس کی روانی،جولانی اور بہاؤ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔گویا ایک جوئے کہستاں الفاظ کے پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ سرمستی سے لبریز ایک وجدانی پیرایہ ہے جو آغازِ سفر سے پایانِ سفر تک قائم ہے۔ اس چیز کو ڈاکٹر عبداللہ عبّاس نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"کتاب کہیں سے کھولئے،انگلیاں جس صفحے کو بھی پلٹ لیں، جس شعر پر بھی نظر جائے ایسا معلوم ہوگا کہ یہی شعر دیوان کی جان اور کتاب کا حاصل ہے۔ پھر کیا مجال کہ آپ اگلے اور پچھلے صفحات کو نظر انداز کر سکیں"

یہ جوشِ کلام معتبر اس وقت ٹھہرتا ہے جب کہ ہوش کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے اور یہی چیز اس مثنّوی کی جان ہے۔ ایک حیرت انگیز تجربہ ہے کہ شاعر نے عشق اور احتیاط،شیفتگی اور توازن،سرمستی و آگہی،عقیدت اور اعتدال کو باہم اس طرح ملا دیا ہے کہ وہ آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔قران حکیم کا یہ ارشاد اسکی نظر میں ہے کہ لاَ تَرفَعوا اَصواتَکُم فَوقَ صَوتِ النَّبی - بیانِ سیرت میں وہ عُرفی کی طرح خبردار ہے کہ

ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

اس سلسلے میں مسلم صاحب اتنے احتیاط کیش واقع ہوئے ہیں کہ جو بات لکھی ہے اسکی سند فراہم کی ہے۔ کسی مجموعہ شعر میں اسناد وشواہد کا ایسا اہتمام میری نظر

سے نہیں گذرا۔ مسلم صاحب نے کتاب کے آخر میں اپنے اشعار کے جملہ حوالے پورے اہتمام کے ساتھ نقل کئے ہیں۔قرآن مجید' احادیث نبوی' تاریخ وسیَر اور دیگر کتابوں کے ۲۶۸ حوالے جمع کئے گئے ہیں اور یہ حوالے ۱۶۰۰ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔اس ضمن میں ۸۰ فیصد حوالے قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ سے فراہم کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کے ایک بند کا ایک دعائیہ مصرع اس طرح ہے کہ-----مرے دست وپا ہوں نہ میرے خلاف -----حوالہ نمبر۲۷ کے تحت اس مصرعے کی سند سورۂ یاسین کی یہ آیت فراہم کرتی ہے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُکَلِّمُنَا اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْ یَکْسِبُوْنَ۔

(آج ہم ان کے منہ بند کئے دیتے ہیں -ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں)۔ اگر مسلم صاحب نے کسی لفظ کا ایسا تلفّظ استعمال کیا ہے جو بظاہر صحیح اور مانوس معلوم نہیں ہوتا تو معتبر فرہنگوں سے اسکی صحّت کا حوالہ بھی ضروری سمجھا گیاہے۔اگر ضرورتِ شعری کے باعث کسی لفظ کی کوئی حرکت گرائی گئی ہے تواسکے لئے بھی باقاعدہ دلیل پیش کی گئی ہے۔

حج ایک سفر ہے 'حضورؐ کی ہجرت ایک سفر ہے اور قرآن مجید میں حصولِ آگہی اور عبرت کی فراہمی کے لئے سفر کی تلقین کی گئی ہے۔مسافرِ حرم نے اس ارشادِ ربّانی اور ہجرتِ پیغمبرؐ اکرم کے پیشِ نظر حکمتِ سفر پر ۴۲ بند تحریر کئے ہیں۔ نظم کا یہ حصّہ فلسفۂ سفر کی ایک مبسوط تفسیر ہے۔ اس سلسلے میں ایسے ایسے نکات بیان ہوئے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ اس ایک لفظ کے اندر کتنی کتابیں سانسیں لے رہی ہیں۔ اس موضوع سے متعلق ہر ایک بند خیال انگیز اور خواندنی ہے ۔میں صرف ایک بند سنانے پر اکتفا

ہوں گا۔

یہ تسبیحِ شمس و قمر بھی سفر
اُفق پر اُبھرتی سحر بھی سفر
ہے بطنِ صدف میں گہر بھی سفر
ندامت بھری چشمِ تر بھی سفر
ہے تطویرِ فکر و نظر بھی سفر
دلوں پر نزولِ خبر بھی سفر
سفر قلب میں دھڑکنوں کی تڑپ
سفر تار میں ہے سُروں کی تڑپ

مسلم صاحب ایک صاحب علم و فضل شخصیت ہیں۔عربی ،فارسی ، ہندی اور پنجابی میں بھی انہیں بڑی دسترس حاصل ہے۔ وہ ان زبانوں کے لفظ لفظ میں چھپی ہوئی تصویروں ، سُروں ،اور رنگوں کو پہچانتے ہیں اور ان کے مختلف مطالب سے کامل آگاہی رکھتے ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے وہ انتہائی ثر وتمند شاعر ہیں اور اس ذخیرے کو اتنا برمحل استعمال کرتے ہیں کہ محل تعمیر کرتے ہیں۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عربی ،فارسی اور اردو کے مشاہیر شعرا کا بڑی دقّتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ان کے ہاں اقبال کا فیضان بھی ہے اور انیس کے تیور بھی موجود ہیں۔مجھے انکی مثنوی کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی مقامات پر یہ احساس ہوا ہے کہ مولاناالطاف حسین حالی حفیظ الجالندھری ، عبدالعزیز خالد سے گلے مل رہے ہیں۔

ع۔س مسلم نے اپنی اس نظم کے لئے وہ بحر انتخاب کی ہے جس میں کئی شاہکار تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ بحر رزمیہ لہجے کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے۔اس میں بزمیہ اور

فلسفیانہ مضامین بھی بیان کئے گئے ہیں۔ فردوسی نے اسی بحر میں ۶۰ ہزار شعر لکھ کر
ایک ایسا ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ایک ہزار سال گذرنے کے باوجود اسکی
مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور اسکے مصرعے آج بھی ہماری گفتگو کا حصّہ
ہیں۔ اسی بحر میں میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اردو میں ایک شاہکار تخلیق ہے۔
حضرت علاّمہ اقبال کی عظیم فکری نظم 'ساقی نامہ' اسی نغمگی سے مرتب ہوئی ہے
اور اسی بحر کی ایک شاہکار موج ع۔س مسلم کی مثمن 'کاروانِ حرم' ہے۔ کلامِ
مسلم آرزو مندی' ہوشمندی اور ہنر مندی کا ایک انتہائی دلآویز امتزاج ہے۔ اپنی ان
خصوصیات کے باعث یہ نظم اتنی منفرد ہے کہ اس کے شاعر کے لئے۔ 'ابولاتمیاز' ہی
موزوں ترین لقب ہو سکتا ہے۔

پیر فضل کا رنگِ غزل

پیر صاحب کی غزل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اِس مضمون میں موضوع سے ہٹی ہوئی کچھ ضمنی باتیں بھی آگئی ہیں اور سلسلہ تحریر کچھ بڑھ گیا ہے اور وہ صرف اس لئے کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے پیر صاحب کی گراں بہا صحبتوں سے بارہا فیضیاب ہونے کا موقع ملا ہے۔ بچپن ہی سے مجھے ان کی شاعری اور شخصیّت سے عقیدت سی ہو گئی۔ میرے ذوق شعر کی تربیت میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ ان کی شفیق راہنمائیوں پر مجھے فخر ہے۔ ان کی شخصیت ایسی شخصیت تھی کہ علاّمہ عرشی امرتسری نے ان کی ہم عصری کی سعادت پر اظہارِ تشکّر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے:۔

میرے دل میں کئی مرتبہ تڑپ اٹھتی ہے کہ میں وارث 'بُلّھے شاہ' ہاشم اور مولوی غلام رسول کے زمانے میں کیوں پیدا نہ ہوا؟ آج 'ڈُونگھے پینڈے' کو دیکھ کر یہ خیال آرہا ہے کہ شُکر ہے میں فضل کا ہم عصر ہوں"۔

سردار گوبند سنگھ کا کہنا ہے:۔

"میرے خیال وچ پیر فضل دیاں غزلاں اجیہیاں نیں جیہڑیاں اُردو تے فارسی دے چوٹی دے شاعراں دے ٹاکرے تے رکھیاں جا سکدیاں نیں۔"

پیر صاحب کے بارے میں کئی ممتاز سخن شناسوں کی آراء بھی ایسی ہی تحسین پر مبنی ہیں۔ ان کی شاعری اور بالخصوص غزل کا موضوع اتنا پھیلا ہوا ہےاور اس کے اتنے پہلو ہیں کہ فضل شناسی کے سلسلے میں جو تنقیدی سرمایہ جمع ہو سکتا ہے وہ پنجابی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

پیر صاحب کی غزل میں روایت کا جو رچاؤ ہے اس کی طرف 'ٹکوراں' کے دیباچے میں شریف کنجاہی صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ میرے خیال میں پیر صاحب کی غزلِ پنجابی میں عجمی شعری روایت کا ظہورِ تازہ ہے۔ ظہورِ تازہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس میں برِ صغیر پاک و ہند اور بالخصوص پنجاب کا مزاج اور اس کی تہذیبی جھلکیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

پیر کی غزل کی فضا میں نمایاں طور پر وہی روایتی بنیادی عناصر ہیں یعنی محبوب' عاشق اور رقیب کی مثلث 'خمریاتی پیکر تراشی' مرغِ نامہ بر' گریبانِ دریدہ 'جنون و زنجیروبہارو بیاباں اور اس قسم کے سارے سلسلے۔ لیکن پیر صاحب انہی موضوعات کے پابند ہو کے نہیں رہ جاتے بلکہ کئی اور موضوعات بھی چل نکلتے ہیں اس سلسلے میں انھوں نے خود کہا ہے۔

کوئی نہیں روکن 'ٹوکن 'ٹھاکن 'ہوڑن ہٹکن والا
چوکڑیاں ہر پاسے بھردائے شوخ غزال غزل دا

شمس قیس رازی نے چھٹی صدی ہجری میں اپنی کتاب 'المعجم' میں غزل کی جو تعریف لکھی ہے وہ آج بھی من بھاتی ہے کہ غزل دراصل ایک لہجے کا نام ہے جس میں کرب بھی ہے اور مٹھاس بھی۔ مختصر یہ کہ فریاد کی اگر کوئی لے ہے تو وہ غزل

یہی لرب امیز ے پیر ی غزل کا طرہ امتیاز ہے ۔ان کے بقول ان کا قلم قرطاس سوزو گداز کے نقشے کھینچتا ہے ۔ شریف کنجاہی صاحب کے تجزیے کے مطابق پیر کی غزل ان کے اندر چھپی ہوئی کسی بے پناہ افسردگی کا بہلاواہے۔ شدید حسرتوں اور محرومیوں کا احساس پیر کے ہاں جاری وساری ہے۔ فرماتے ہیں۔

حسرتاں دا پورا ہوجانا تے اک پاسے رہیا
ایہہ وی حسرت ای رہی کوئی چیر کے دل و یکھدا

ان محرومیوں کی جلن کے باعث پیر کا یہ عالم ہے کہ وہ درزی کو بھی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ میرے کرتے کا گھیرذرا کھُلا رکھنا کیونکہ میرے وجود کے اندر سوزہجر کی بڑی گرمی ہے۔ اس سوزِ غم ہائے نہانی کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میری دایہ نے غموں کی گھُٹی گھول کر میرے منہ سے لگائی تھی۔
پیر کی غزل سے قریب تر ہونے سے معلوم ہوتاہے کہ یہ شخص اپنی ذات کے اندر اَن گنت دکھ سمیٹے بیٹھا ہے۔

پھولیا تے اوہ نکل آیا غماں دا بادشہ
فضل تائیں اک فقیرِ بے نوا جاتا سی میں

میرا تاثر یہ ہے کہ پیر کی غزل میں اندوہِ بیکراں کا وہی اندوختہ ہے جو میر تقی کے دل پر نازل ہوا تھا۔ میں پیرؔ اور میرؔ کا موازنہ نہیں کررہا۔ یہ بڑا نازک اور بڑی ذِمّہ داری کا کام ہے ۔ میر کی استادی کے سامنے تو غالب بھی کورنش بجالاتاہے۔ اس کے یہاں جو معصوم تہہ داری ہے وہ گداز مندوں کے لیے ایک الگ آشوبِ چشم ہے ۔ پیر کے تذکرے میں ذکرِ میراس لیے در آیا ہے کہ دونوں کے یہاں دردِ جانکاہ کا رشتہ

مشترک ہے اور یہ ایک متاعِ کمیاب ہے۔ خود پیر صاحب فرماتے ہیں:۔

عرش ہلانے والیاں ہوون وِرلیاں وِرلیاں کُوکاں
چھیک دلاں وچ پائے کوئی اتھرو ناتواں ناتواں

جہاں تک شاعری کے پر سوز ہونے کا تعلق ہے تاتاری حملے کے بعد سے فارسی شاعری کی لے بھی خاصی غم انگیز رہی ہے لیکن پھر بھی اس میں وہ نشتریت موجود نہیں جو برِّ صغیر پاک وہند کی بھاشا اور اُردو شاعری میں پائی جاتی ہے۔ اُردو میں اس کا سب سے بڑا نمائندہ میر تقی کا کلام ہے۔ اس کے لیے جس غمزدگی اور خستگی کی ضرورت ہے وہ میر کے ہاں بدرجہ اتم ہے۔ پیر کے پاس بھی یہ دولت شکستہ دلی فراواں ہے۔ ان کے کلام میں اس کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

اوہ جفا اپنی دی کجھ ویکھناں چاہندے نیں بہار
میں کدی کولوں دی لنگھداں تے بُلا لیندے نیں

پیار تِرے دی نسبت اج پچھے دیکھن والے کہندے نیں
اللہ دے رنگ نیارے نیں پر ظاہری حالت ٹھیک نئیں

اساں نئیں ظالما دنیا تے رہناں
توں لاہ لے سدّھراں کر لے جفا ہور

جے آکھیں تے دیاں تکلیف تینوں
جے اڈّے تے مری مٹّی اُڈا ہور

چڑھے چن نہ چڑھے پوہ دے مہینے
غریباں تے شباب آوے نہ آوے

ایک غزل کی ردیف کے استفہامی لہجے کی صاعقہ ریزیاں ذرا ملاحظہ ہوں۔

میں کیہڑی اپنی درداں دنیا وچ وسّاں کیہ دسّاں
کس گلے پیاّں چہرے تے رو رو کے لسّاں کیہ دسّاں

رنگ کھُلاّ میری وحشت دا ہو کیتھے گُم ہمدرد گئے
اوہ رو رو پُچھّن حال مرا میں کھڑ کھڑ ہسّاں کیہ دسّاں

کوئی دیکھے میریاں زخماں نوں کوئی بھرنے دی تجویز کرے
کوئی جھاسیانا دسّے نہ میں کِنھوں دسّاں کیہ دسّاں

کیوں فضل سودائی ہویا ایں پلّے دیاں لیراں لاہیاں نی
پھڑ پلاّ لوکی پچھدے نیں میں پلاّ کھسّاں کیہ دسّاں

شعر میں یہ تاثیریوں ہی نہیں آجاتی ۔ نالہ نے میں سرورے پیدا کرنے کے لیے فنّی ریاضتوں کے کڑے کوس بھی طے کرنے پڑتے ہیں۔ پیران غزل گو شعرا میں سے نہیں ہے جن کے یہاں الفاظ صرف گرجتے ہیں اور برسنے کانام نہیں لیتے۔ عام انسانی تجربہ ہے کہ بعض کھانا تیاّر کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ سارے مصالحے اور سارے لوازمات میسّر ہونے کے باوجود ان کے ہاتھ مین لذّت نہیں ہوتی اور نوالہ گلے سے اُترنا مشکل ہوجاتا ہے اور بعض کے ہاں ایسا قرینہ ہوتا ہے کہ آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ آرٹ کی دنیا میں اسی قرینے کو پیشکش کہا جاتا ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو پُرپیچ تخلیقی عمل کے پُر اسرار مرحلوں میں فن کار کی رہنمائی کرتا چلا جاتا ہے۔ جو فن کار بھی اس قرینے کی خونِ جگر سے تربیت کرتا رہتا ہے اس کے فن میں ورائے شاعری چیزِ دگر کی جھلکیاں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیر نے طویل کربِ تخلیق کے روح فرسا عمل سے گذرنے کے بعد یہ قرینہ خُو کرلیا ہے اور اس کے ہاتھ

میں وہ جادو آگیا ہے ہے جو زہر کو امرت اور مٹّی کو اکسیر بنا دیتا ہے۔

زمانے کی بے ثباتی اور انقلابِ دوراں کا تقریباً" ہر شاعر نے رونا رویا ہے ۔خیّام جیسے شعرا نے تو مستقل طور پر اسی غم کے لاشے کو اٹھایا ہوا ہے ۔اس وہم مستعار کے بارے میں تو اقبال کی لے بھی حزنیہ ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ پیر فضل نے اپنے مخصوص انداز میں پنجاب کی فضا سے ہم آہنگ ہو کر اس مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے۔

سدا نہ دن سونے رونٹے سدا نہ نویاں کوراں
سدا نہ رگیٹاں توڑی لاچا سدا نہ بانکیاں نوراں

سدا نہ کن من ساون والی سدا نہ کوئل کُوکے
سدا نہ امبیاں میٹھاں آکے پیلاں پانیاں موراں

سدا نہ نازک شاخاں اُتّے حال پھُلاں نوں چینے
سدا نہ گیہ کے فضل قوالی کرنی بلبل ہوراں

فقیر منش اور عشق پیشہ دیوانوں کے بارے میں مادّی دنیا کی آلائشوں میں دھنسے ہوے دنیا داروں کا روّیہ ازل سے سنگدلانہ ہے۔ ان کے پاس ان درویشوں کے لیے تہمتوں کے پتھّروں اور تمسخُر کے تیروں کے سوا ہوتا ہی کیاہے ۔ایک درد مند انسان اس لیے اس دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس اس کو پہچاننے والی نظر نہیں ہوتی۔ پیر کی شاعری میں اس کورے رویّے کے خلاف احتجاجِ زیرِ لبی کی ایک لہر رواں دواں ہے۔

دنیں جنہاں نوں ویکھ جہان رووے تے اوہ ویکھ جہان دے وَل ہسّن
کے خندہ پیشانیؔ دی یاد اندر اُٹھ کے رون والے پِشلی رات دے نین

میں اپنی وستی وچ اینج دن اپنا فضل گذار دیاں
جس طراں مسافر ہوندے نیں کجھ اکھڑے پکھڑے شاماں نوں

اسی احتجاج سے لبریز ایک غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

سودائیاں نوں بیٹھن دیہو جھل نہ پاؤ لوکو
دارو واری دیہندے جاؤ لنگھی جاؤ لوکو

میں سر نا حق تہمت دھردیو میں کیہ کہواں تہانوں
جو جو مونہوں کڈھو شالا جھولی پاؤ لوکو

نہ ہاکر نہ توڑی مارو نہ ٹھیکر نہ روڑا
آپ اسی ہاں اڈن ہارے نہ گھبراؤ لوکو

فقیروں کے ان پتھروں کے ساتھ جب شبلی کا پھول شامل ہوجاتا ہے تو اور ہی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

گل میری نسبت کیتی اے اک نویں لباساں والے نے
ایہہ لیراں لتھا کدھرے داکیہ چمبڑ وانگوں لیر گیا

میر تقی کو یہ احساس بہت ستاتا رہا ہے کہ ان کے رونے دھونے سے ان کے ہمسایوں کے آرام میں بڑا خلل واقع ہوتا ہے۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

گجرات کی گڑھی شاہدولہ کے پیر فضل کے یہاں بھی یہ Social Consideration بہت زیادہ ہے۔

فضل مرے واویلیاں ہتھوں تنگ گوانڈھی سارے
غصّے دے وچ دونویں گڑھیاں بھڑک پیاں اج فیر

اج راتیں نیّیں سُنیاں کدھرے فضل دیاں کرلاٹاں
سُتّا سوں گیا نہ ہووے عاشق زار کسے دا

فضل چھڈ ذاویلے نوں تے سون ہمسایاں نوں دے
رات مُک چلی اے ویلا رہ گیا تھوڑا جیہا

قاتل کی خونریزی اور پشیمانی کے موضوع کو پیر نے جس انداز سے نبھایا ہے یہ انہی کا حصّہ ہے۔

کیہ ویکھن والے ویہندے نیں دو بُونداں میرے خون دیاں
اوہ ویکھن متھا قاتل دا لگّی ہوئی جھڑی پسینے دی

پیرکی غزل کی مجموعی فضا حسن کی اداؤں اور عشق کی کیفیّتوں کا مرقّع ہے۔ اس کے دل میں ہلچل مچا دینے والے جذبوں میں رشک و رقابت کا جذبہ بڑا بھرا ہوا اور سُلگتا ہوا ہے ۔ معاملاتِ شوق اور کاروبارِ محبت میں اس کے لئے شرکتِ غیر ناقابل برداشت ہے ۔ عرصہِ محبّت میں کاش کہ تم مرے لئے ہوتے۔ اسکا نعرۂ مستقل ہے۔ پیر کے یہاں اس جذبے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ جذبہ کسی خاص فرد سے نفرت اور بیر نہیں ہے بلکہ زندگی کی منفی اور تخریبی اقدار سے بیزاری کا اظہار ہے۔ یہ دراصل ان باطنی خباثتوں کی مذمّت ہے جن کا منتہائے مقصود

ہوس پستی، عشرت کوشی، فتنہ پردازی اور الزام تراشی ہے۔ اسی لئے پیر نے رقیب کے بارے میں بڑا تلخ لہجہ اختیار کیا ہے۔ اسے صرف روسیہ کہہ دینے سے پیر کے دل کی بھڑاس نہیں نکلتی بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر کہتے ہیں۔

اج تھاں تھاں جھوٹھیاں تہمتاں دے بالن ہر میرے اُتے بال آیائے
روسیہ رقیب نمردوپے نے دتّا تپا دا رنگ چواتیاں نوں

رقیب کے معاملے میں محبوب سے پیر کا ایک استفسار دیکھئے

اج مرا رقیب نئیں نال کوئی اج کلیاں قصد شکار دا اے
ایہہ نواں قاعدہ کتھوں سکھیا جے کُتّے چھڈ کے پشاں شکار جاناں

بہرحال پیر نے ان قبیح سرگرمیوں کے سامنے خاموشی اختیار نہیں کی بلکہ ان سے نمٹنے کے لیے جوابی کارروائی کرنے کے شدید عزم کا اظہار کیا ہے۔

مینوں دشمناں غلط سمجھیا اے نازک نرم حریری تار وانگوں
میں اُلجھیا تے وخت پا دیناں ئیں زلف سوہنیاں دی سحدار وانگوں

رقیب کے سلسلے میں پیر نے ایک طویل مضمون کو انتہائی ایجاز اور اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے مضمون یہ ہے کہ عاشق کا جنازہ اُٹھا تو محبوب بھی اپنے دل پر جفاؤں کی پشیمانی کا بوجھ لیے ہوئے جنازے میں شامل ہوگیا۔ اس ماتمی تقریب میں محبوب کی شرکت کو دیکھ کر رقیبوں کو اتنا قلق ہوا کہ انھوں نے سینہ کوبی شروع کردی اور اس طرح ماتم کی چیخیں اور بھی بڑھ گئی یعنی کس قہر کی موت ہے کہ دشمن بھی نوحہ کناں ہیں۔ پیر نے اس مضمون کو میر کی مختصر بحر ۔۔۔ کرے گا ایک عالم غم ہمارا ۔۔۔ میں اسطرح سمویا ہے۔

اوہ پڑے یار آ رَلیا جنازے
پھبایا دشمناں ماتم اساڈا

پیر کی غزل کا ایک پہلو صوفیانہ اور عارفانہ مضامین بھی ہیں۔ دولتِ فقر ان کا خاندانی ورثہ ہے۔ وہ حضرت شاہدولہ دریائی کی اولاد میں سے ہیں اور خود بھی عمر بھر تصوّف کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا رہے ۔ درویشی ، سادگی ، تسلیم ورضا،وسعتِ مشرب، دلآزاری سے گریز اور احترامِ آدمیّت ان کا مسلک رہا ہے۔ پیر صاحب اپنے ہر ملنے والے کو اس خلوص اور انکسار سے ملتے تھے کہ دوسرے کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ کسی کا مقولہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ کنجوس وہ شخص ہے جو مسکرا بھی نہیں سکتا۔اس معیار کے مطابق اگر غیر سگالی کی مسکراہٹ جود و سخا ہے تو میں نے پیر فضل جیسا کوئی سخی کم ہی دیکھا ہے ۔انکسار کے بارے میں جرمن مُفکّر شوپنہار کا کہنا ہے کہ ہربڑا آدمی لوگوں سے اپنے گناہِ عظمت کی معافی مانگتا پھرتا ہے یہی معذرت انکسار کہلاتی ہے۔

شوپنہار کے اس قنوطی تجزیے سے کسی اخلاقی فضیلت کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ بہر حال زندگی کی کچھ اعلٰی مثبت قدریں ہیں۔ پیر صاحب ان اخلاقِ جمیلہ کو شوکت دارائی سے بہتر سمجھتے ہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کو دولتِ فقر عطا ہوتی ہے ان کی نظر میں جامِ جم اور آئینہِ سکندر کسی کشکول کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔

دولت فقر دی جنھاں نوں لبھ جائے اُونہاں لوکاں دی فضلؔ نگہ اندر
جم دا جام سکندر دا آئینہ چربے جاپدے کسے کچکول دے نیں

پیر صاحب کی غزل میں ایک ایسے رِندِ پاکباز کا تصوّر ابھرتا ہے جوتنگ نظری اور نمودونمائش سے بیزار ہے۔ وہ دنیا داروں کی فانی چاہتوں سے بے انتہا بلند ہے۔ اس

ے اندر انسانیت کے اعلیٰ اوصاف ہیں اور اسے ریاکارانہ زہدِ خشک سے کوئی دلچسپی نہیں۔

پیر صاحب نے ایک مقام پر ایک ایسی صورتحال پیدا کی ہے کہ واعظ اپنی در پردہ کارروائیوں کا پول کھلنے پر خود ان رندانِ پاکباز کی برتری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈگا میخانے دے در اگےّ رنداں چُک لیا آکھ کے بسم اللہ
واعظ من گیا میرے تھیں بوہت چنگے تیرے رہن والے خرابات دے نیں

فقرِ غیور کی شان یہ ہے کہ دستِ سوال دراز کرنے اور کسی کا احسان اٹھانے سے گریزاں رہتا ہے۔ اس موضوع پر پیر صاحب کا یہ شعر اپنی مثال آپ ہے۔

میں فضل نہ مردی واری وی احسان اٹھایا لوکاں دا
کُجھ آپوں ہمّت کیتی تے مونہہ قبلے دے وَل بھوں گیا

خدا سے بے نیازی اور خدا کی ذات پر ایمانِ کامل تصوّف کی تمام تعلیم کا نچوڑ ہے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں۔

کیہ ہویا جے بند دروازے ہین امیراں کیتے
فضل فقیرا کیہ ڈر تینوں اللہ دائے در کُھلاّ

ذاتِ الٰہی سے عشق اور اس کی پردہ در پردہ تجلیّوں سے رُوشناس ہونے کی آرزو کی بے پناہی کا اظہار پیر کی غزل میں جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔

کِتھےّ ڈھونڈیے تے کِتھےّ ڈھونڈیے نہ گل کوئی نہ سمجھ دے وچ آوے
ہین ہرتھانویں ڈیرہ لا بیٹھے نالے آکھدے نیں کوئی نہیں تھاں میری

پیر کی غزل کی ایک امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں بھرتی کے شعر نہیں ملتے۔ پھیکے اور تھوتھے اشعار کو غزل میں شامل کرنا پیر نے شروع ہی سے اپنی شانِ غزل کے منافی سمجھا ہے۔ کوئی شخص اگر پیر کے کلام کا انتخاب کرنے بیٹھے تو پیر کے دیوان میں سے کچھ چھوڑنا اتنا مشکل ہو جائے گا کہ اسے یہ خیال ہی چھوڑنا پڑے گا۔

دنیا کا کوئی شاعر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے کسی دوسرے شاعر سے استفادہ نہیں کیا۔ تاریخ شعر کا ارتقائی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اخذو استفادہ کی رسم شروع سے چلی آ رہی ہے۔ فن کی یہ مشعلیں اس طرح روشن ہیں کہ ایک روشنی کے ہاتھ میں دوسری کا ہاتھ ہے۔ وارث شاہ، غلام رسول اور میاں محمدؐ صاحب نے فارسی ادب کے شہپاروں سے بھرپور کسبِ فیض کیا ہے اور اپنے رنگ کی چمک دے کر فارسی کے کئی شعر اور مصرعے ترجمہ کر ڈالے ہیں۔ پیر صاحب کے یہاں اس اکتساب کی ایسی جھلکیاں موجود ہیں جنہیں حسنِ اکتساب کے بغیر چارہ نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ترجمہ اور خصوصاً شعر کا شعر میں ترجمہ انتہائی دشوار کام ہے۔ ایک زبان کے اُسلوبِ اظہار کو دوسری زبان میں ڈھونڈ نکالنا بذات خود ایک کٹھن ہے اور پھر اس میں کچھ اضافہ بھی ہو جائے تو کیا کہنے!

سعدی کا مشہور شعر ہے

نیکی کن اے فلان و غنیمت شمار عُمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

پیر صاحب نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

نیکی کرلے اے فلانے تے کر کجھ عمل سیانا
ایہ اک روز آوازہ اوناں نیں اج نئیں رہیا فُلانا

فارسی کا یہ مصرع کس نے نہ سنا ہو گا۔

من نکردوم شما حذر بکنید

پیر صاحب نے اسے پنجابی میں یوں کہا ہے۔

میں نئیں اپنا آپ بچایا تُسی بچاؤ لوکو

غالب کا ایک شعر ہے۔

در کشاکشِ ضُعفم نگسلد رواں از تن
این کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہا ست

یعنی کشاکش ضعف سے میری روح میرے جسم سے جدا نہیں ہوپاتی۔۔۔ یہ جو میں نہیں مر رہا یہ بھی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں

بند ضعف ہتھیں اکھیاں رہندیاں نین جائے بولیاں تھِڑک زبان میری
جیواں میں کمزوری دے زور اُتے لباں تیک نئیں پہُنچدی جان میری

مومن کا مشہور شعر ہے

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آج اپنے دام میں صیّاد آ گیا

امیر خسرو کا یہ معروف شعر

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
درد مندِ عشق را دارُو بجز دیدار نیست

پیر صاحب نے ایک ہی غزل میں مومن اور خسرو کے ان دونوں شعروں کو بڑی عمدہ صورت میں پنجابی کے پیکر میں اِسطرح ڈھالا ہے

اوہ ویکھو اج آپ شکاری اپنے قابو آیا
اوہنوں ہُن نہ شیشے اگّوں دے زلفاں دی پھاہی

اے حاذق بن دید سجن دے ہور نہ دارُو ساڈا
دل جلیاں دے نئیں موافق کاہو، گُلقند کاہی

پیر صاحب کے بارے میں ایک رائے یہ بھی قائم کی گئی ہے کہ وہ پنجابی غزل کے حافظ ہیں۔ میرے خیال میں پیر صاحب اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کی عظمت کو ثابت کرنے کے لیے انھیں کسی بڑے شاعر کے مقابلے میں لایا جائے۔ یہ بجا ہے کہ ان کے کلام میں حافظ شیراز، میر تقی میر، اور امیر خسرو کے انداز کی جھلکیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی اپنی ایک آواز ہے جو آسانی سے پہچانی جاتی ہے اور ان کی انفرادی عظمت کی گواہی دیتی ہے۔

آج کل یہ بھی ایک اصولِ تنقید رواج پاگیا ہے کہ ہر شاعر کے ہاں زمان ومکان کی گتھیوں کے حل اور حیات وکائنات کے پر پیچ مسائل کا سراغ لگانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ان مطالبات کا رخ اگر اقبال اور رومی کی طرف ہوتو یہ انصاف کی بات ہے کیونکہ یہ شعرا اس بات کے مُدّعی ہیں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کسی شاعر نے اپنے موضوع کا کیا تعیّن کیا ہے اور پھر فنّی اعتبار سے وہ اس موضوع کے اظہار سے کس حد تک عہدہ براہوا ہے ۔ پیر صاحب کی شاعری پر بھی ان کے متعیّن کردہ موضوعات کے حوالے سے ہی نظر ڈالنی چاہیے۔ اس اعتبار سے یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی

ہے کہ پیر نے فن کی انتہائی بلندیوں کو چھُو لیا ہے۔

پیر کے ہاں ایک بے ساختہ داخلیت کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی خود مرکزیت کا نقطہ پھیل کر کبھی کبھی دائرہ بھی بن جاتا ہے اور جب خارج سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو زمانے کے مروّجہ معیارِ فضیلت پر طنز کرتا ہے۔

فضل وچ شعراں دے ڈونگھی سوچ دا کیہ فائدہ
لوک مُونہہ ویہندے نیں اج کوئی ہنر ویہندا نئیں

اور کبھی زندگی کی مشکلات کے سامنے حوصلہ مندی کا درس دیتا ہے۔

جو چھالا پیندا ای وِنھّی جا جو کنڈا چُبھّی کڈّھی جا
چھُٹّے گی منزل پیر ترے توں راہیا پینڈا وڈّھی جا

پیر کی ناصحانہ لَے کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ان کے کئی شعروں میں معنویت کی ایسی لہر اُٹھتی ہے جو بیک وقت ذاتی، سماجی اور سیاسی سطحوں کو ایک ادا میں رضا مند کر جاتی ہے۔مثال کے طور پر

پھلاں دی چونڈی منگاں میں اوہ دیندائے چونبھڑ خاراں دی
ایہہ کیہڑا آکھے مالی نوں نئیں رہنی رُت بہاراں دی

خاراں نوں گُل جان کے گَل نال لٹکاندا رہیا
میں سمجھ کے لعل انگیاراں توں ہتھ پاندا رہیا

ساقی دے نال لڑائیاں نیں گل اوڑک کدھرے مُکّے گی
اوہ دیندائے ساغر موہرے دا میں منگاں جام حیاتی دا

پیر صاحب کی زبان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی پنجابی بڑی فارسی

آمیز ہے۔ یہ ایک بڑی طول طویل بحث ہے۔ اس کے جواب میں مختصر گزارش یہ ہے کہ لسانیاتی تجزیئے کے مطابق پنجابی اردو سے قدیم تر ہے اور اردو کے مقابلے میں فارسی سے قریب تر۔ ایرانی محقّق سعیدِ نفیسی کی تحقیق کے مطابق اُردو میں فارسی کے ساٹھ فیصد الفاظ ہیں۔ اب پنجابی میں اس نسبت کا اندازہ خود ہی کر لیجئے۔ عابد علی عابد مرحوم کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ پنجابی فارسی کی قدیم صورت یعنی پہلوی کا ایک لہجہ ہے۔ ہم اپنی روزمرّہ گفتگو میں بیشتر الفاظ فارسی اور عربی کے بولتے ہیں لیکن ہمیں محسوس نہیں ہوتا کیونکہ بعض اوقات ان کے تلفّظ کی صورت کچھ بدلی ہوئی ہوتی ہے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پیر فضل نے غزل کی متانت اور نزاکت کے پیش نظر فارسی کے بعض الفاظ کو فارسی ہی کے تلفظ میں استعمال کیا ہے اور یہ بات ان کے شاعرانہ کمال کے منافی نہیں ۔غالب اور اقبال کے اردو کلام میں بے پناہ فارسیت ہے لیکن کیا اس سے ان کی عظمت میں کمی آگئی ہے؟ وارث شاہ میاں محمّد اور مولوی غلام رسول کے ہاں فارسی کا بے اندازہ استعمال ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ بڑے شاعر ہیں۔ میں تو اپنے قومی تشخص کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری اردو اور پنجابی کا رخ سانسکرت اور بھاشا کے بجائے عربی اور فارسی کی طرف ہونا چاہئے۔

اب پیر کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں عربی اور فارسی کے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں:۔ مرض 'تماشا' نظر' سلسلہ' دوا اور دربان۔ لیکن پیر نے انھیں پنجابی کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

مرض کُجھ ہور سی کیتی دوا ہور
تماشا بن گیا کُجھ ہور دا ہور

اوہ چڑھیا فضل درباناں دی نظرے
اوہ لگّا جے بنّن کُجھ سلسلہ ہور

پیر کے کلام میں ایسی مثالیں اتنی عام ہیں کہ ڈھونڈنی نہیں پڑتیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون پیر کی غزل پر ایک طائرانہ سی تاثّراتی نظر ہے اور پیر صرف غزل کا شاعر ہی نہیں انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اپنی دلکشی اور تاثیر کے لحاظ سے ان کی غزلیات سے کسی طرح پیچھے نہیں اور اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ پیر نظم کا بڑا شاعر ہے یا غزل کا۔ شریف کنجاہی صاحب نے پیر صاحب کی سوہنی کے قصّے والی نظم 'دامن' کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

" روا روی مُڑدے جُڑدے لفظاں دے قافلے بلخ بخارے دے تاجراں وانگوں اظہار دیاں دولتاں تھاں تھاں ونڈدے نظر آوندے نیں۔"

شریف صاحب کی یہ رائے پیر کی ساری نظمیہ شاعری پر صادق آتی ہے۔

پیر کی نعتیہ شاعری ابھی زیر اشاعت ہے۔عشق رسولؐ پیر کی کتاب حیات کا ایک الگ باب ہے جناب رسالت مابؐ کے حضور میں عقیدت میں بھیگے ہوئے پیر کے یہ شعری نذرانے انتہائی وجد آفریں ہیں کیونکہ اس انسان اکمل کے بارے میں پیر کا عقیدہ یہی ہے کہ

خیمہ افلاک کا اِستادہ اِسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اِسی نام سے ہے

پیر صاحب اپنی مشہور نعتیہ نظم 'چن' میں فرماتے ہیں کہ چونکہ اس زمین میں حضورؐ کا جسدِ اطہر مدفون ہے چاند اسی لئے اسکا طواف کرتا رہتا ہے۔ نعتوں کے علاوہ پیر صاحب نے بہت سی منقبتیں بھی لکھی ہیں۔(۱)

پنجابی ادب کے نقّاد کو ابھی پیر صاحب کی شاعری کے تنقیدی ہالے متعیّن کرنے

۱۔ یہ "مجموعہ قطبی تارا" کے نام سے اور ان کی منظومات کا مجموعہ "نکوراں" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

ہیں۔ ان کے سوانحی خط وخال کے آئینے میں ان کے کلام کے بہت سے پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ہے۔انھوں نے پنجابی شاعری میں جو انقلاب برپا کیا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہے۔

جدید اردو غزل بڑی منزلیں مار چکی ہے اور جدید دور کے مسائل' احساسات اور علوم کی پھیلتی ہوئی لہروں کو اپنے اندر جذب کرتی ہوئی آگے ہی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود میرؔ کا فرمایا ہوا آج بھی مستند ہے۔ اسی طرح پنجابی غزل میں رنگ جدید کے بڑے عمدہ اضافے ہورہے ہیں اورہوتے چلے جائیں گے لیکن اس میدان میں 'ڈونگھے پینڈے' کے مسافر پیر فضل گجراتی کی عظمت ہمیشہ مُسلّم رہے گی اور یہ ماننا پڑے گا۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

دو آتشہ

(آسیر عابد کا دیوانِ غالب)

جن دنوں میں لاہور میں ایم اے کا طالب علم تھا ناصر کاظمی مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ایک دن میں نے ناصر سے پوچھا کہ آپ میر تقی میر کے بڑے معتقد اور شیدائی ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کی شاعری پر میر کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ غالب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ ؟ ناصر نے فوراً جواب دیا کہ بھائی غالب کے قریب جانے سے تو ہمارے پر جلنے لگتے ہیں۔ ناصر کاظمی کی اس بات پر میں بہت غور کرتا رہا اس لیے کہ اس نے ایک انتہائی سچّی بات کہی تھی۔

غالب کی امیجری پر اگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسکے ہاں زیادہ تر تصویریں آگ سے بنتی ہیں اور اس کی پیکر تراشی آتشی ہے۔ آگ میں جتنی خاصیتیں ہیں۔وہ سب کی سب غالب کی شاعری میں پائی جاتی ہیں کیااس شعرمیں شعلے کی سی لپک نہیں ہے؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے؟
تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

شعلے کا رُخ بلندی کی طرف رہتا ہے اور وہ سر جھکانا نہیں جانتا۔سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟ اس شعر میں یہی روّیہ توبول رہا ہے۔ غالب کے جوہرِ اندیشہ میں بلا کی گرمی ہے۔سوزِ غم ہائے نہانی اور آہِ آتشیں کے بیکراں سلسلے ہیں۔ اس کے پسندیدہ رنگ میں بھی آگ کی سرخیوں کے مختلف شیڈز(shades) دکھائی دیتے ہیں۔یہاں تک کہ آنکھوں سے بہتی ہوئی جوئے خوں میں بھی شمعِ فروزاں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ خود بھی کہتا ہے۔

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

عبدالرحمٰن چغتائی کو غالبؔ کی اس آتش مزاجی سے کمال درجے کی شناسائی حاصل تھی اسی لئے تو اس نے

رو میں رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی تصویر بناتے ہوئے ایک جلتا ہوا چراغ دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا ہے۔میرؔاور غالب کا موازنہ کیا جائے تو کہا جاسکتا کہ میر کی امیجری آبی ہے اور غالب کی آتشی بلکہ میر کے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ

ایک سب آگ ---ایک سب پانی

کہنے کامطلب یہ ہے ناصر کاظمی نے جس آگ کی طرف اشارہ کیا تھا اسیؔر عابد نے اس کے نزدیک جانے کا حوصلہ پیدا کر لیاہے ۔ترجمہ اور پھر غالب کا ترجمہ اور پھر اس کے پورے دیوان کا ترجمہ اور پھر ٹھیٹھ پنجابی میں اس ریختہ کا ترجمہ جورشکِ فارسی ہے۔

یہ کام صرف اسیر عابد کے ہاتھوں سرانجام پایا ہے ——— جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

مجنوں باہجوں عشق مدانے کوئی رڑے نہ چڑھیا سی

ابھی ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی نے غالب کی آتشی پیکر تراشی کے راز کو پالیا ہے۔ اسیر عابد کا پنجابی ترجمہ بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ غالب کی نوائے آتشیں کے جملہ سوزناک پیرایوں کا محرم ہے۔ اسے بھرپور احساس ہے کہ وہ ایک بڑی منفرد اور تُند و توانا آواز کے الاؤ کو پنجابی کے الفاظ میں ڈھال رہا ہے۔ اس ترجمے اور ترجمانی کے دوران اسے غالب کے تخیّل کی آتش کرداری بدرجۂ اُتم ملحوظ رہی ہے۔ اسیر عابد کے ترجمے میں ایسی مثالیں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کہتا ہے۔

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

ترجمے کے تیور دیکھیے۔

دل ہندا تے آپے تینوں بلدے داغ وکھاندا
میں ایہہ دیوے کِتھے بالاں بالن والا بلیا

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسیر عابد نے داغوں کی بہار کا ترجمہ بلدے داغ کیا ہے۔غالب کا مشہور شعر ہے

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہُوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہُوا

اسیر کا ترجمہ یوں ہے۔

جگ دنیا تے نقش وفا دا من بھرواسا ہویا نہ
ایہ کوئی لفظ نصیباں سڑیا معنے جوگا ہویا نہ

ملاحظہ فرمایئے 'نصیباں سڑیا' کا اضافہ غالب کے مزاج سے کتنا ہم آہنگ ہے۔
غالب کا یہ شعر دیکھئے

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

امیر عابد نے اس کے ترجمے میں 'دھوخ' کا لفظ استعمال کر کے اس تاثر کو کتنا آتشناک بنا دیا ہے۔

آخر پیڑاں ہالی دھوخ نہ کڈھی سی
فیر ترے ٹر چین دا ویلا یاد پیا

غالب فرماتے ہیں۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اکھیں دیکھ کے غیر نوں ایس تائے کیوں نہ پوے کلیجڑے ٹھنڈ منیوں
ساڑ پھوکدا سی نال ہوکیاں دے نالے حاصلاں دا طلبگار وی سی

اس ترجمے میں 'ایس تائے' اور 'ساڑ پھوکدا سی' کے استعمال سے کیفیتِ شعر کس قدر قرینِ مزاجِ غالب محسوس ہوتی ہے۔ اب یہ شعر اور اس کا ترجمہ دیکھئے۔

سب رقیبوں سے ہیں نا خوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

سارے سڑن رقیباں توں پر سینے ٹھنڈ زلیخا دے
مصری ناراں تک یوسف نوں بکّیاں بکّیاں ہو گئیاں

اس مقام پر نا خوش کا ترجمہ 'سڑن' سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے اور ناراں کے لفظ میں شعلہ رُخانِ مصر کی کیا تصویرِ فروزاں دکھائی دیتی ہے۔
غالب کا ایک اور شعر یاد آرہا ہے جس میں آگ کا ہم معنی کوئی لفظ موجود نہیں لیکن اسیر کے ترجمے سے یوں لگا ہے جیسے کسی شعلہ زار کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔

ہوئی ہے کثرتِ غم سے تلف کیفیّتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دکھ دیاں فوجاں سکھ سواداں نوں انج اگاں لائیاں نیں
عید سویرا لگے جیویں پاٹا گلماں لیراں دا

اسیر عابد نے کیفیت شادی کے تلف ہو جانے کو آگ کا الاؤ کہا ہے اور پھر اس الاؤ کو 'پاٹا گلماں لیراں دا' کہہ کر تشبیہ کر مصّور کیا ہے۔ جب الاؤ سے شعلے اُٹھتے ہیں تو وہ 'پاٹیاں لیراں' کا ایک پھریرا سا بن جاتا ہے۔ یہ ترجمہ غالب کے سخنِ گرم سے کتنا ہم آہنگ ہے۔
اس ضمن مین صرف ایک اور شعر کا حوالہ دے کر مضمون کو آگے بڑھاتا ہوں۔غالب کی ایک غزل مسلسل کا ایک معروف شعر ہے۔

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

اسیر نے اپنے ترجمے میں غالب کی آتش مزاجی کی رعایت کس قرینے سے ملحوظ رکھی ہے۔

فیر اج رُوپ ڈھنڈورے دِتّے نازاں نے
تتّے تا عُشّاقاں نے جند واری اے

ترجمے کے بارے میں بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ 'بسکہ دشوار ہے۔' روحِ خیّام کوجذب کئے بغیر فٹزجیرالڈ کا ترجمے اور ترجمانی کا عظیم کارنامہ ہرگز وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ کسی جذبے اور خیال کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اِسطرح منتقل کر دینا کہ اسکی تاثیر اور کیفیت برقرار رہے بڑا جان جوکھوں کام ہے اور اس میں سو فیصد کامیابی امرِمحال ہے۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ مُصنّف کا مزاج شناس ہو' اسکی زبان سے گہری آگہی رکھتا ہو اوراپنی زبان میں ایسی استعداد کا حامل ہو جس کے بل پر زبان نئی جتوں اور نئے ذائقوں سے آشنا ہو سکے۔

مجھے اسیر عابد کا ترجمہ شدہ دیوان غالب کا نسخہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی معرفت صرف اِتنے عرصے کے لئے ملا کہ میں اس کو بمشکل کہیں کہیں سے دیکھ سکا۔ اس سرسری مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب کے کماحقہ' مطالعے کے لئے بڑی توجہ اور بڑا وقت درکار ہے ۔یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غالب کے گنجینہ معنی تک کامل رسائی اتنی آسانی سے نہیں ہوسکتی اور ذہن کوگوہرِ معانی تک پہنچنے کے لئے بسااوقات کئی ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں ۔اس مختصر سے مطالعے سے صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اسیر عابد کے ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت اسکی خستگی ناپذیر تلاش ہے۔ وہ لفظی ترجمے سے گریزاں ہے ۔اس کا ہدف یہ ہے کہ غالب کے ہاں جو ایکسپریشن (EXPRESSION)موجود ہے پنجابی میں اِس کا صحیح متبادل تلاش کیاجائے اور غالب کی ترکیبوں کو پنجابی ماحول اور پنجابی فضا کے مطابق ڈھالنے کی اسکی کاوش واقعی قابلِ ستائش ہے ۔ستائش کے لفظ سے غالب کا مصرع یاد آیا۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا

اور اب اس ستا ئشگری کا اسیر عابد کے ہاں پنجابی ایکسپریشن ملاحظہ ہو۔

مُلّاں ایڈا ٹوہر بنائے جیہڑے باغ بہشتاں دا

غالب نے کہا تھا 'کچھ خیال آیا تھا وحشت کا'۔ اب اس کا لفظی ترجمہ مقصود ہوتا تو مسئلہ بالکل سیدھا تھا۔ 'کجھ خیال آیا سی وحشت دا' لیکن اسیرعابد دل کی تسلی کا کیا کرے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پنجابی کا کیا برابر کا پیرایہ لے کر آیا ہے۔

دل کِیتا سی جھَل کدائیے

غالب کی ترکیبوں کو پنجابی تراکیب میں ڈھالنے میں اس نے عجیب ندرتِ ایجاد سے کام لیا ہے غالب کے 'طاقِ نسیاں' کی صورت اسیرعابد کے ہاں "بھُل پڑچھتّی" ہے۔ 'سوز نہاں' 'گجھا سیک' ہے 'دلِ حسرت زدہ' 'سَدھراں پھنڈیا دِل' اور 'خوباں کے ساتھ اسد کی چھیڑ' پنجابی میں 'اِٹ کھڑکّا' بن گئی ہے۔جلاّد کے آگے نشاط کے ساتھ چلنے کی کیفیت بھنگڑے کی صورت اختیار کر گئی ہے اور غالب کی 'نوائے سروش' اسیر کے ہاں 'جبریل ککارا' بن گئی ہے۔

اسیرعابد کوشش یہ کرتا ہے کہ غالب کا خیال پنجابی کی پوشاک پہن کر ویسی ہی سج دھج والا دکھائی دے جیسا کہ لباسِ ریختہ میں لگتا ہے۔ غالب کہتا ہے:

دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

اسیر کا ترجمہ دیکھئے:

دِل توں مُندی نین کٹاری وِچ کلیجے لَیہہ گئی

غالب کہتا ہے:

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق

اسیر کا ترجمہ دیکھئے:

جھَلِ عِشقے دی چوگ لِکھی اے کھنگروٹیاں اُتے

• غالب نے کہا:

سر کھُجاتا ہوں جہاں زخمِ سَر اچھّا ہوجائے

اسیر نے یوں ترجمہ کیا:

اوتھے نیر جلو ہن اے جتھّے سِر دے پھٹ کھریہنڈ پیا

غالب نے کہا:

بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو

ذرا ترجمے کے تیور ملاحظہ ہوں،

میری چُنڈ نہ گلّ کردی چھپڑی سَت سمندراں دی

مصرعوں کے بعد اب نمونے کے طور پر دو تین شعر:

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے جس دم چاہو
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ترجمہ:

مِٹھیاں ہو کے سَد لئے مَینوں بھانویں کیہڑے ویلے
مَیں کوئی لنگھیا ویلا نئیں جو پرت کے آ نئیں سکدا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ترجمہ:

تیرے 'ہُو' دے ویروے واہ سائیں اُتّوں غالبا کٹک بیان تیرا
جے کرپین دی تینوں نہ مار ہُندی ساڈے لئی توُں ولی اوتار ہوندا

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ترجمہ:

جے کر سَتل دِلے دا نظریں آوے نہ!
یار طبیبا تینوں مُشک وی آوندی نئیں؟

جہاں اسیر عابد کو یہ احساس ہوتا ہے کہ پنجابی ایکسپریشن غالب کا ساتھ نہیں دے رہا تو پھر وہ ایسے معاون کلمات لاتا ہے جو اس کمی کو بطریقِ احسن پورا کر دیتے ہیں اور یہ وہ اہم بات ہے جس کی طرف احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے۔ غالب کی مشہور غزل 'کوئی صورت نظر نہیں آتی' کا پورا ترجمہ اس اہتمام کی گواہی دیتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ترجمہ:

مَنیا متّھے نیکیاں اجر ودھیرے نیں
ایسے پاسے طبع کپتّی آوندی نئیں

اس شعر میں 'کپتّی' کے اضافے نے کیفیتِ شعر کو بھرپور طریقے سے پنجابی میں منتقل کر دیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اسیر عابد لفظی ترجمے سے گریزاں ہے۔ وہ غالب کی ردیفوں اور بحروں کا پابند بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو ترجمہ کرتے ہوئے غالب کی پہلی غزل کی ردیف اور بحر بھی بدل دی ہے۔ غالب نے اس غزل کے پہلے شعر میں بڑے معرکے کا مضمون باندھا ہے۔ کاتبِ تقدیر کے حضور شُکر کے ساتھ شکایت کو بھی ملا دیا ہے۔ اسیر عابد اس غزل کا ترجمہ کرتے ہوئے ردیف کے لیے 'سائیں' کا لفظ لے کر آیا ہے اور اس مقام پر پنجابی میں اس سے زیادہ موزوں ردیف کا انتخاب

ممکن بھی نہیں ہے۔بحر بھی اس نے ہیر کی منتخب کی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ترجمہ:

چتر چیکدا اے چتر کار کہیڑے کھیکھن گُنھیا وِچ تحریر سائیں
چولے کاغذی ساریاں مُورتاں دے، بے وَسّیاں بے تقصیر سائیں

اس شعر میں تو یوں لگتا ہے جیسے اسیر عابد کاایک ہاتھ غالب کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سیّد وارث شاہ کے ہاتھ میں ۔اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ غالب کامشاہدہ مرکّب ہے ۔وہ جب کسی ایک نقطے پر نظر ڈالتاہے تواسکی نظر تمام مربوط نقطوں کا احاط کرلیتی ہے ۔اسی کو اس کی پہلوداری کہا جاتاہے۔ غالب کی اس پہلوداری اور اسکے منفردِ اُسلوبِ بیان کو پنجابی کے رنگ میں رنگنے کی اسیر عابد نے ایسی کوشش کی ہے جس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

میرے کئی شاعر اور ادیب دوستوں نے اس بات کا بَرملا اعتراف کیا ہے کہ غالب کے بہت سے ایسے شعر جن کے معانی ان پر پوری طرح واضح نہیں ہوسکے تھے اسیر عابد کے ترجمے کے مطالعے سے ان مشکل اشعار کے مفہوم کے دریچے کُھل گئے ہیں۔ مَیں نے بھی اس ضمن میں اس ترجمے سے بڑا اِستفادہ کیا ہے ۔بلا شبہ اسیر عابد کا ترجمہِ دیوانِ غالبؔ، غالب شناسی کے سلسلے میں ایک عُقدہ کُشا کارنامہ ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ اصل متن سے بُعد پیدا کرتاہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اسیر عابد کا ترجمہ غالب کے متن سے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ایشیائی زبانوں میں سے کس زبان کا کس زبان میں انتہائی زور دار ترجمہ ہو سکتا ہے تو میرا جواب ہے فارسی کا پنجابی میں ۔ہمارے صوفی شعرا نے رومی 'سعدی اور حافظِ شیراز کے بعض اشعار کے بڑے جاندار ترجمے، کئے

ہیں۔

سُن لکڑ دی ونجھلی کولوں دَرد وِچھوڑا دُکھ دا

یہ مصرع 'بشنو از نے چوں حکایت می کند' کا ترجمہ ہی تو ہے پورا شعر ایک مصرعے میں سمٹ آیا ہے۔

نال شرابے رنگ مصلّٰی جے ہادی فرماوے

یہ حافظ کا ترجمہ ہے 'بہ مے سجّادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید'

اور یہ سعدی سے استفادہ ہے:

دشمن مَرے تے خوشی نہ کریے سجناں وی مَرجانا

اے دوست برجنازۂ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ برتو ہمیں ماجرا رَوَد

فارسی سے ہماری نئی نسل بہت دُور ہوتی جارہی ہے۔اسیر عابد کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ہمارے صوفی شعرا کی اس روایت کی تجدید کرے اور غالب کے فارسی کلام اور حضرتِ علّامہ اقبال کے فارسی اشعار و آثار کو پنجابی میں ڈھالنے کا اہتمام کرے۔اس لیے کہ ایک پڑھا لکھا اور خوش ذوق پنجابی بانگِ درا'بالِ جبریل اور اردو شاعری کے دیگر شاہکاروں سے پہلے ہی گھنی شناسائی رکھتا ہے۔

اسیر عابد کے ترجمہ دیوان غالبؔ میں ہمارے پنجابی کے عظیم متقدّمین کے تراجم کی سی جو تب و تاب پائی جاتی ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ غالب کی اردو بڑی فارسیّت مآب ہے۔

اسیر عابد کے 'دیوانِ غالب' کے منظوم پنجابی ترجمے کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا رہا ہے کہ ہر شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے اسیر عابد یہ سوچتا رہا ہے کہ غالب اگر اپنی انہی قلبی اور ذہنی توانائیوں کے ساتھ اکبر آباد کے بجائے لاہور یا اس کے مضافات میں پیدا ہوگیا ہوتا اور پنجابی میں شعر کہتا تو اس مضمون کو کس پیرائے میں بیان کرتا۔ اس ضمن میں اسیر عابد نے پنجابی زبان کے امکانات کو ٹٹولنے کی حتّی الامکان کوشش کی ہے اور اس کامیاب کوشش نے پنجابی زبان کو مالا مال کر دیا ہے۔ شریف

کنجاہی صاحب نے اسیر عابد کے ترجے پر تبصرہ کرتے ہوئے درست کہا ہے:۔

" پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر بہانا ہر تیشے والے کے بس کی بات نہیں یہ کام اسیر عابد ہی کر سکتا تھا"۔ اس مقام پر شریف کنجاہی صاحب کے بعد روحی کنجاہی صاحب کی اس رائے کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جس کا اظہار انھوں نے اسیر عابد کے ترجے سے متعلق منعقدہ ایک تقریب میں کیا ہے۔ روحی صاحب کا خیال ہے:۔

" اس دور میں اُردواور پنجابی کے بیشتر شعراء تخلیق کے نام پر ترجمہ کررہے ہیں اور وہ بھی ناکام جبکہ اسیر عابد کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے ترجے کے نام پر زبردست تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے"۔

مَیں نے اسیر عابد کو جو مشورے دیئے ہیں وہ بھی اس بنیاد پردیئے گئے ہیں کہ اسکی ترجمہ کرنے کی استعداد نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا ہے ۔اسکی یہ صلاحیت ایسی توانا اور منفرد ہے کہ

خامہ انگشت بدنداں ہے اِسے کیا لکھیے
"قلماں اُنگلاں منہ وِچ پائیاں کِیہ لِکھئے چا اِیہنوں"

(سیالکوٹ میں حلقۂ اربابِ غالب کے زیرِ اہتمام منعقدہ تقریب میں پڑھاگیا)

شریف کنجاہی ـــــــ چند تاثرات

چند روز پہلے سرور کامران صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور یہ خوشخبری سنائی کہ ہم شریف کنجاہی صاحب کے ساتھ ایک شام منانا چاہتے ہیں اور آپکو بھی اس محفل میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اسکے بعد کامران صاحب نے متکلمی پیسنکچوایشن کا ایک خفیف سا وقفہ دیا اور یہ ارشاد کیا کہ آپکو بھی شریف صاحب پر کچھ لکھنا اور پڑھنا ہوگا۔ سرور صاحب یہ کہہ کر چلے گئے اور مجھے اس سوچ میں چھوڑ گئے کہ شریف صاحب کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے واقعی پہلی شرط آدمی کا پڑھا لکھا ہونا ہے اور شریف صاحب کی عالمانہ شخصیت کا تعارف ایسی آسان بات بھی نہیں۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر میں نے کسی موضوع کے تعیّن سے گریز

کیا ہے اور شریف صاحب کی شخصیت شاعری اور ادبی کارناموں کے سلسلے میں چند تاثرات بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔

سوچتاہوں کیوں نہ اس مضمون کو اسی روایتی جملے سے شروع کیا جائے کہ شریف صاحب واقعی اسم با مسمیٰ ہیں۔ لیکن اس لفظ پر منوبھائی 'جگراتے' میں نہایت قیمتی انکشافات کی روشنی میں خاصا دلچسپ تبصرہ کرچکے ہیں۔ اور مزید مشکل یہ آن پڑی ہے کہ اس لفظ کے جملہ حقوق بحق احمد ندیم قاسمی محفوظ ہوچکے ہیں۔اس کا متبادل انگریزی کا جینٹل مین ، فارسی کا آزاد مرد اور ہندی کا بھلا مانس بھی کوتاہیِ اظہار کی مثالیں ہیں۔ شریف صاحب کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو بیان کرنے کے لئے پنجابی کا ایک لفظ انتہائی موزوں معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے ـــــ بیبا

شریف صاحب واقعی بڑے بیبے آدمی ہیں۔ اس لفظ کی ساری صوتی اور معنوی دھاریاں انکی شخصیت میں دکھائی دیتی ہیں۔ کُنجاہ کی سرزمین بڑی مردم خیز ہے جس نے عہدِ عالمگیر میں غنیمت جیسے فارسی کے عظیم شاعر کو جنم دیا اور گرم وسرد عالمگیر جنگوں کے زمانے میں شریف کنجاہی جیسا آشتی پسند شاعراور مفکّر پیدا کیا۔

جس زمانے میں ہم زندگی بسر کررہے ہیں یہ وہ دور ہے جس میں عام طور پر لوگوں نے مصلحت کے غلاف ہی نہیں بلکہ لحاف اوڑھ رکھّے ہیں۔ لیکن شریف صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کسی تکلّف کو اپنی زندگی میں کہیں بھی روا نہیں رکّھا۔ان کے نزدیک یہ ظاہر داریاں سب کھوکھلے پن کی علامت ہیں۔ڈرائنگ روم میں پردے لٹکے رہیں اور باورچی خانے میں ہانڈیاں کُھلی پڑی رہیں' شریف صاحب اِس وتیرے کے حق میں نہیں ہیں۔ان کی صاف گوئی کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے کہ لاہور میں کسی تقریب کے موقع پر میں نے ان سے دریافت کیا کہ اب آپ شعر بہت کم کہتے ہیں اسکی کیا وجہ ہے؟

کہنے لگے۔ "سچی گل ایہ وے یار کہ شعراں نوں خضاب نئیں لایا جا سکدا"

شریف صاحب کا یہ قول انکے مزاج کی حقیقت پسندی کی بھرپور آئینہ داری کرتا ہے۔ان کی طبیعت منافقت سے ایک دم بیزار ہے۔

پروفیسر چوہدری فضل حسین میرے استاد ہیں اور شریف صاحب کے بڑے گہرے دوست ۔شریف صاحب نے اپنے پنجابی مجموعہ کلام 'جگراتے' کا انتساب بھی انہی کے نام کیا ہے۔چوہدری صاحب کے جہاں مجھ پر اور بہت سے احسانات ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے شریف صاحب سے میری جان پہچان کرائی۔ یہ ۱۹۵۷ء کا واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں زمیندار کالج میں ایک تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں شریف صاحب نے جذبہ آزادی سے لبریز ایک نظم سنائی جس کا ایک شعر مجھے ابتک یاد ہے جس میں انگریز کے حاشیہ برداروں کی ان الفاظ میں مذمت کی گئی تھی۔

کوئی حد بھی ہے پستی کی 'رزالت کی 'دنائت کی
کہ چوروں سے زکوٰتیں لے کے جینے پر قناعت کی

جہاں تک شریف صاحب کی مفکرانہ حیثیت کا تعلق ہے تو چوہدری فضل حسین کے بقول "شریف اگلے زمانے کا کوئی رشی منی ہے جس نے زندگی بھر زندگی پر غور کیا ہے ۔یہ وہ مسافر ہے جو دھیان کی اگنی میں نروان کے پھول ڈھونڈنے نکلا ہے"

چوہدری صاحب کا یہ تبصرہ انتہائی جامع ہے اس لئے کہ شریف صاحب کے مقدر میں خوئے سقراط لکھ دی گئی ہے۔ان کی تنہائیاں سوچوں کا زینہ بہ زینہ سفر ہیں۔ لمبی لمبی راتوں میں ان کا حصہ صرف بے خواب آنکھیں اور سلگتی ہوئی کروٹیں ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ جایئے' ان کی باتیں سنئے' انکے لکھے ہوئے اکھر پڑھئے تو آزارِ آگہی کا دور

تک پھیلا ہوا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔یہی درد ہے جو شریف صاحب کی تخلیقات میں روشنی بن کر اُبھرتا ہے ۔ستارے تڑپتے ہیں اسی لئے چمکتے ہیں۔ شریف صاحب نے زندگی کے مسائل پر حتیّ الامکان بے طرف ہو کر غور کیا ہے اور ہر مسئلے کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کی ہے اور یہ وہ کٹھن کام ہے جس سے کوئی کوئی عہدہ برا ہوتا ہے۔

شریف صاحب کے نزدیک انسان کی کچھ ازلی اور ابدلی محرومیاں ہیں ۔انسان مجبوریوں سے مصالحت کرنے پر بھی مجبور ہے اور یہ قناعت اسے یہاں تک لے جاتی ہے کہ قفس کو آشیاں کہتے ہوئے تسکین محسوس کرنے لگتا ہے۔شریف صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں ہمارے ڈور نہیں اور جس کے ہاتھ میں ہے اس پر کسی کا زور نہیں ۔کچھ نہ کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا اور کچھ کرنے سے بھی کیا ہوتا ہے؟

یہ تو خیر مجبوریوں کا قصّہ اور مختاریوں کی تُہمت کا باب ہے۔شریف صاحب کے لئے سب سے اَذیت ناک مسئلہ انسان کا انسان سے برتاؤ ہے۔مذہب کی اصطلاح میں جسے نفس امّارہ کہاجاتاہے اورنئے فیشن کی گفتگو جسے اندر کا وحشی کہتی ہے یہی وہ موذی ہے جس نے ساری انسانیت کا چین برباد کر رکّھا ہے جسے صرف تلواروں کے دستے بنانے کی دُھن ہے اورپیڑوں کی چھاؤں کے لُٹ جانے کی کوئی پروانہیں۔ورڈزورتھ کے الفاظ میں کہاجائے توشریف صاحب کی ساری شاعری کاخلاصہ یہ ہے کہ

WHAT MAN HAS MADE OF MAN

آخر یہ کیا قصّہ ہے کہ کہ دنیا بھر کی سچّائیاں لاٹھی پر لکھی ہوئی ہیں اور لاٹھی والے کے سامنے دلیلِ آفتاب بھی گہنائی ہوئی ہے۔شریف صاحب اس اِستحصال کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ انھوں نے اِسی احتجاج کا علَم اٹھایا ہوا ہے۔انکے علَم کا رنگ سفید ہے جس پر فاختہ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اس ضمن میں مجھے یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ شریف صاحب اور میں گوجر خان کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے راولپنڈی کی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو میں نے شریف صاحب کو اپنی تازہ غزل کا ایک شعر سنانے کی جسارت کی۔ اتنے میں بس پہنچ گئی لیکن شریف صاحب نے سوار ہونے سے انکار کر دیا اسلیئے کہ وہ شعر کے تاثر کو بس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ شریف صاحب نے میرے ایک شعر کو اس تحسین کا مستحق سمجھا۔ میں وہ شعر بھی سنائے دیتا ہوں۔

زہر ایجاد کرو اور یہ پیہم سوچو
زندگی ہے کہ نہیں دوسرے سیّاروں میں

اصل میں یہ شریف صاحب کے دل کی آواز تھی ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ انکو فرشتوں کی اس بات میں بڑی صداقت نظر آتی ہے جو تخلیقِ بشر کے موقع پر انھوں نے باری تعالیٰ کے حضور کہی تھی کہ انسان زمین پر خون بہائے گا۔

انسان کے تجسّس نے بیشمار چیزوں کے ذائقوں کی نشاہدی کی ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کی تحقیق ہو چکی ہے کہ جو دسترس سے باہر ہوں ذائقے کے لحاظ سے وہ انگور کھٹے ہوتے ہیں۔ اور نارسائی کا [illegible] جائے تو یہ تُرشی شیرینی میں بدل جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور تحقیق یہ بھی ہے کہ ایک چیز ایسی ہے جس کا ذائقہ ہر زمان و مکان میں ایک سا رہتا ہے۔ بالکل کونین اور چرائتے کی طرح ــــ اور یہ وہ چیز ہے جسے عرفِ عام میں سچائی کہا جاتا ہے۔ شریف صاحب کی ہمّت ہے کہ انکی زبان اس ذائقے کی عادی ہو چکی ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم میں ایسی بہت سے کڑوی کسیلی باتیں جمع کر دی ہیں۔ یہ نظم انکے طرزِ فکر کی پوری نمائندگی کرتی ہے۔ میں اس نظم کا صرف ایک حصّہ نقل کرنا چاہتا ہوں صرف یہ بتانے کے لئے کہ ایک

جیسے آدمی کے بول ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔لیجئے سماعت فرمایئے۔

جے میں آکھاں اسی تُسی ہاں اک آدم دے جائے
کیوں مڑ اک ونگیاراں کٹے تے اک ویہلیاں کھائے

جے میں آکھاں دنیا اُتّے بے گھر کوئی نہ ہووے
جے میں آکھاں بڈھے ویلے ٹوکری کوئی نہ ڈھووے

جے میں آکھاں رسّا لُونا سارے رل کے کھایئے
اک دُوجے دیاں بانہواں بنئے نالے بھار ونڈایئے

جے میں آکھاں جھگڑیاں والیاں ساریاں مسلاں ٹھپّیے
مار مکاؤ گلّاں دے وچ ناں ہفئے ناں تھکئے

تاں میں بھیڑا، تاں میں جُھوٹھا میرے بول اوّلے
چنگ تہاڈی ہٹّی وِکدا سچّ تہاڈے پلّے

گذرتا ہوا وقت جو تغیرات برپا کرتا چلا جا رہا ہے شریف صاحب کی شاعری میں اس کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔زمانہ بھی عجیب سوداگر ہے کہ کلائیوں سے چوُڑیاں لے جاتا ہے اور جُھرّیاں دے جاتا ہے۔اس موضوع پر شریف صاحب نے ایک عظیم نظم تخلیق کی ہے۔زندگی کی زود گذری کے اظہار کے لئے انہوں نے کسی خمریاتی

پیکر تراشی کا سہارا نہیں لیا۔ نظم کے لفظ لفظ میں اپنے ماحول اور دیس کی بُو باس رچی ہوئی ہے۔

ترا پِنڈا پوری تُوت دی تری لغراں ورگی بانہہ
ترے مُل نے پُھل انار دے ترا جوبن ون دی چھاں

ایہ چھانواں سدا نہ رہندیاں رہ جائے پچھے ناں
اسی رب سببیں گورئیے آ نکلے ایس گراں

اساں جھٹ دوپہر گذارنی اساں مُہتا نئیں پڑاں
اساں پنڈ نہ پانے جوگیاں اساں مُل نئیں لینی تھاں

کس تکّے پاکے بیٹھناں ایہ دنیا اِک سراں
ترے جوبن وانگوں گورئیے اسی کُلّ مسافر ہاں

شریف صاحب کی پنجابی نظموں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے میرے نزدیک وہ پنجابی کی خالص ترین صورت ہے۔ اتنی پوِتر پنجابی میری نظر سے بہت کم گذری ہے۔ زبان کی یہ سادگی اصل میں ان کے فکر کی صفائی کی وجہ سے ہے جس پر پیچیدگی کی کوئی دُھند اور ابہام کی کوئی پھپھوندی دکھائی نہیں دیتی۔ ادب میں یہ جو رجحان در آیا ہے کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی' شریف صاحب کے نزدیک یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اگلے زمانے میں بھی شعروں میں پہیلیاں کہنے کا رواج تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ

جمہور کا احترام یہی نہیں کہ ان کے نام کا نعرہ لگادیا جائے۔ انصاف یہ ہے کہ لطفِ سخن میں انہیں بھی پوری طرح شریک کیا جائے۔ٹالسٹائی نے اپنے نظریہِ فن میں لکھا ہے کہ کسی فن پارے کی قدر و قیمت اس بات سے متعیّن ہوتی ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ کتنے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔اس لحاظ سے شریف صاحب کا لہجہ بے انتہا اہمیت کاحامل ہے اور پنجابی ادب میں گراں بہا اضافہ ہے۔ شریف صاحب کے تکلّمی لہجے نے خود مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے اور اس اثر کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے۔میں نے شریف صاحب سے یہ بات سیکھی ہے کہ شاعری میں کیوں نہ وہ زبان استعمال کی جائے جو معاشرے کی رگوں میں لہو بن کے دوڑتی ہے۔پنجابی معلّٰی سے پنجابی محلّہ زیادہ معتبر ہے۔

شریف صاحب نے اُردو فارسی اور پنجابی تینوں زبانوں کو اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور شاعری تنقید اور ترجمہ تینوں میدانوں میں کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ جس طرح ان کا تخلیقی کام بڑی اہمیت رکھتاہے اسی طرح ان کا ترجمے کا کام بھی زبردست ارزش کا حامل ہے۔ترجمہ یوں بھی قومی اور بینَ الاقوامی روابط کے فروغ کا ذریعہ ہے۔ گوئٹے نے کہا کے کہ جملہ امورِ عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر وقیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت ہی دشوار ہے اور اس میں دُہری تہری صلاحیّت درکار ہوتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے۔موضوعِ متن سے بھی طبعی مناسبت درکار ہے۔ مصنّف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی رابطہ لازمی ہے۔میں تخلیقی ترجمے کی بات کر رہا ہوں مشینی ترجمے کی بات نہیں ہورہی ۔

علمی دنیا میں حضرت علّامہ اقبال کے انگریزی لیکچرز (Reconstruction of Religious Thought in Islam) کی جو اہمّیت ہے اس سے

کون انکار کر سکتا ہے اسلئے کہ وہ سائنس، فلسفے اور مذہب کے عظیم مباحث پر مشتمل
ہیں۔ان میں علم و عرفان کی بحث چھیڑی گئی ہے۔عقل اور وجدان کا مسئلہ زیرِ بحث آیا
ہے۔خدا کی ہستی اور دعا کی حقیقت پر غور و فکر کیا گیا ہے۔ نفسِ انسانی، اسلامی ثقافت
کی روح، اجتہاد اور مذہب کے مستقبل کے بارے میں بڑی باریک اور گہری باتیں بیان
ہوئی ہیں۔ "تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے سیّد نذیر نیازی مرحوم کا ان
خطبات کا اُردو ترجمہ بھی میری نظر سے گذرا ہے لیکن وہ ایسا گرہ کشا ترجمہ نہیں ہے
جیسا کہ شریف صاحب نے ان لیکچروں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ
بھاری بھر کم علمی اصطلاحات کو انھوں نے پنجابی کے قالب میں کیسے ڈھال دیا ہے؟ اور
یہ حرفِ پیچا پیچ نہایت سلیس پنجابی میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود
بھی کئی لفظ Coin کئے ہیں اور آس پاس کی زبانوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ مروّج
اصطلاحات کے استعمال کے ساتھ بڑی نادر اصطلاحات وضع کی ہیں۔اِملا کے سلسلے میں
بھی انھوں نے ضروری ترامیم سے کام لیا ہے جو پنجابی اِملا میں گراں قدر تجربے کی
حیثیت رکھتی ہیں۔فلسفے سے دلچسپی، اقبال سے تعلق خاطر اور پنجابی زبان سے بے
پایاں محبت ان تینوں چیزوں نے مل کر اس کارنامے کو جنم دیا ہے۔شریف صاحب نے
بلاشبہ اقبال کی اس خواہش کا احترام کیا ہے۔

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

شریف صاحب نے قرآنی آیات کا ترجمہ اتنا عمدہ کیا ہے کہ میرے دل میں خواہش
پیدا ہوئی کہ شریف صاحب قرآن مجید کے پنجابی ترجمے کی طرف متوجہ ہوں۔ (1)

---

(1) ماشاء اللہ شریف صاحب قرآن مجید کا پنجابی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔

اسی طرح اقبال کی عظیم تصنیف 'جاوید نامہ' جو دنیا کے خلَاقی(1) ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے شریف صاحب کی کوشش سے پنجابی نظم کا پیر ہن پہن چکی ہے۔ شریف صاحب نے یہ ترجمہ نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔اس ترجمے میں شریف صاحب اس وقت سے دو چار نہیں ہوئے ہونگے جو انگریزی خطبات کا ترجمہ کرتے ہوئے انہیں پیش آئی ہوگی۔

میں اپنے تجربے کے بنیاد پر یہ سمجھتا ہوں کہ فارسی کا بہترین ترجمہ صرف پنجابی میں ہو سکتا ہے ۔فارسی کا طرۂ اِمتیاز اسکا اختصار ہے اور یہ چیز پنجابی کو بھی نصیب ہے۔ بلکہ ہنر مندی کا مظاہرہ کیا جائے تو فارسی کے دو مصرعوں کو پنجابی کے ایک مصرعے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔اب یہ دو مصرعے ہی تو تھے۔

اے دوست بر جنازہ دشمن چو بگذری
شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود

میاں محمد صاحب نے اس شعر کو ایک مصرعے میں ڈھال دیا ہے۔

دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے سجنان وی مرجانا ئیں

رومی کی مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

بشنو از نے چون حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

میاں صاحب فرماتے ہیں --

---

(1) خلَاقی ادب سے مرد وہ ادب ہے جو آسمانوں کی سیر سے متعلق ہے جس کا سرچشمہ واقعہ معراج ہے ۔ سنائی کی سیر العباد الی المعاد' معرّی کا رسالتہ الغفران اور دانتے کی طربیہ آسمانی (Divine Comedy) اسی ذیل میں آتی ہے۔

سن لکڑ دی دنبھلی کولوں درد وچھوڑا دُکھ دا

حافظ کا مشہور مصرع ہے۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغان گوید

میاں صاحب کا ترجمہ دیکھیے

نال شرابے رنگ مصلیٰ جے ہادی فرماوے

اقبال نے رومی کے بارے میں کہا ہے

پائے او محکم فتد در کوے دوست

پنجابی میں اس کا ترجمہ یوں گا :

اوہدا پیر یار دی گلی وچ بڑا پیڈا پیندا ئے۔۔اس مصرعے کا کسی اور زبان میں اتنا پیڈا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ پنجابی کا فارسی کے ساتھ بڑا گہرا لسانی رابطہ ہے بلکہ سیّد عابد علی عابد کی تحقیق کی رو سے پنجابی پہلوی زبان ہی کا ایک لہجہ ہے۔

فرانسیسی میں کہا گیاہے کہ ترجمے خوبصورت عورتوں کی طرح ہوتے ہیں اور خوبصورت عورتیں بے وفا ہوتی ہیں، یعنی خوبصورت ترجمہ اصل سے انحراف کر جاتا ہے۔ بہرحال یہ بات شریف صاحب کی ترجمہ کاری پر لاگو نہیں ہوتی اسلیئے کہ ان کا ترجمہ اصل سے قریب بھی ہے اور خوبصورت بھی۔

شریف صاحب نے پنجابی کے ساتھ محبّت کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے اور اس کا حق ادا کردیا ہے۔ انکی پنجابی شاعری، پنجابی میں انکی نفسیاتی تنقید، خطباتِ اقبال اور جاوید نامے کے ترجمے نے پنجابی کوبڑا اِعتبار بخشا ہے۔ پنجابی کو شریف کنجاہی میسّر نہ آتا تو اس کو یہ قابلِ فخر علمی مرتبہ اور مقام حاصل نہ ہوتا۔شریف کنجاہی کے طفیل اب تو پنجابی بڑی روانی کے ساتھ فلسفہ بولنے لگی ہے۔

امجد اسلام امجد

امجد کی پچاسویں سالگرہ کے حوالے سے اس کے ایک شاگردِ عزیز زاہد حسن نے "امجد اسلام امجد ۔ فن و شخصیّت' کے نام سے ایک مبسوط کتاب مرتّب کی ہے جس میں امجد کی شخصیّت اور اس کی متنوّع تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں معاصر مشاہیر ادب کی آراء کو جمع کیا گیا ہے۔ جب یہ کتاب میرے ہاتھ لگی تو پہلی خواہش یہ پیدا ہوئی کہ یہ دیکھوں کہ عطاءُ الحق قاسمی امجد کے بارے میں کیا لکھتا ہے اس لئے کہ ان کی رفاقت ماشاء اللہ یک جان دو قالب کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ عطا کے خاکے کا عنوان 'جانِ جاناں' خاصا جاندار محسوس ہوا لیکن زیرِ عنوان کی ساری عبارت کے انبار سے آئیں بائیں شائیں اور گپ شپ کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا ۔ عطا نے خود اعتراف کیا ہے کہ کاغذ یہ بارِ امانت نہیں اُٹھا سکتا ۔ لیکن اس نیارے میں ایک بڑا سُنہری جملہ بھی موجود ہے۔

"امجد اسلا م امجد تو وہی ہے جو محفل میں قہقہے لگاتا ہے اور کاغذ پر اُداس لفظ لکھتا ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ اگر امجد سے کہا جائے کہ وہ خود اپنی شخصیّت کے بارے میں

اظہارِ خیال کرے تو وہ بھی اسی خاکے کی پیروڈی کی ایک صورت ہو گی۔اس ضمن میں عطا کے اظہار "من تو شدم تو من شدی" کی کیفیت سے پیدا ہوا ہے۔

یہ تمہید اس لئے ضروری سمجھی گئی ہے کہ میرا اور امجد کا معاملہ بھی عطاءُ الحق قاسمی جیسا ہے ۔ وہ میرے لئے ایسا ہے جیسے کوئی اتنا دکھائی دے کہ دکھائی ہی نہ دے۔ فاصلہ سمٹ جائے تو چشمِ بینا بھی معذور ہو کر رہ جاتی ہے ۔

آ گر اسقدر قریب نہ آ کہ تماشا محال ہو جائے

امجد کے تعارف کے سلسلے میں درپیش دشواری سے عہدہ برا ہونے کے لئے میں نے یہی سوچا ہے کہ اپنی کوئی رائے دینے کی بجائے صرف وہ باتیں لکھ دوں جو دوسروں نے اس کے بارے میں کہی ہیں یعنی۔ خویش را دیدن بنورِ دیگرے ۔ امجد نے ابھی اپنی عمر کے پچاسویں سال کی سرحد کو عبور کیا ہے ۔ وہ اپنے بڑھاپے کی جوانی کی منزل پر ہے۔ لیکن اس کے علمی اور ادبی کارناموں کو دیکھ کر انسانی ہمّت کے دائرے کی وسعت کا بھرپور احساس ہوتا ہے ۔ اس کا یہ کام کمیّت ہی نہیں 'کیفیّت کے اعتبار سے بھی ارزش اور اہمیت کا حامل ہے۔ ڈرامہ نگاری میں اس نے ایسا مقام حاصل کیا ہے کہ اندرونِ ملک اور بیرونی دنیا میں وہ ایک جانا پہچانا نام ہے۔ 'وارث' کے چینی ترجمے نے تو ایک ارب سے زاید چینیوں کو امجد کا گرویدہ بنا رکھا ہے ۔ مشتاق یوسفی لکھتے ہیں ۔

"ہم نے وطن عزیز میں یہ نقشہ دیکھا کہ امجد اسلام امجد کی وجہ سے سڑکوں سے ٹریفک یکسر غائب ہوجاتا ہے۔ جس وقت ان کا یادگار سیریل 'وارث' ٹی وی پر دکھایا جاتا تھا تو لوگ گھروں سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ بے صبرے دولہا بھی سہرا لٹکائے ٹی ۔ وی کے سامنے بیٹھے رہتے تھے کہ عقد گاہ جانا بے سود ہے اس لئے کہ قاضی صاحب قسط دیکھنے کے بعد غسل کرکے روانہ ہوں گے۔ خود دلہن بھی وارث دیکھے بغیر 'قبول ہے' نہیں کہے گی ۔ ہمارے ہاں اور کون ہے جسے ایسی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی ؟؟"

اس سلسلے میں امجد کی منہ بول بہن پروین شاکر کا بسرانہ شوخی سے بھرپور تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"ابھی پرسوں کوئی دلّی میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہاں امجد کے ڈرامے اتنے مقبول ہیں کہ جب اس کی کوئی سیریل چل رہی ہوتی ہے تو اسوقت امرتسر کے بازاروں میں سنّاٹا ہوجاتا ہے اور دلّی سے بطور خاص لوگ بذریعہ ٹرین ایک دن کے لئے امرتسر جاتے ہیں۔ امرتسر کی غالب آبادی کے پیش نظر وہاں کے بازاروں کا سنّاٹا تو سمجھ میں آتا ہے ـــــ یہ اہل دلّی کو کیا ہوا؟"

امجد نے وارث کے بعد دہلیز' رات' دن' فشار' نذر' وقت' لہو میں پھول اور اگر جیسے عظیم ڈرامے تخلیق کئے۔ غلام محمّد قاصر نے اس کے بارے میں کتنا درست کہا ہے۔

چرخِ تمثیل پہ مہتاب درخشاں ہے وہ نام
جس کے کردار محبّت کی زباں بولتے ہیں
جنبشِ چشم سے اسرارِ نہاں کھولتے ہیں

اس کی پوروں میں کہیں نصب ہے آئینۂ عصر
عکس چلتے ہیں مگر خود وہ پسِ پردہ ہے
محرمِ دوش ہے اور منتظرِ فردا ہے

امجد کے ڈرامے لاکھوں انسانوں کے دُکھی دلوں کی بازگشت ہیں۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال نے روئے زمین پر جو قیامت برپا کررکھی ہے امجد نے انتہائی دلسوزی اور کمالِ ہنرمندی سے ناظرین کو اس کا احوال دکھایا ہے کہ عقلِ عیّار اور زر و زمین کی ہوس بشر کو کس طرح تحت البشر بنادیتی ہے۔ کس طرح ہچکیوں اور سسکیوں کی تدفین سے عشرت کدوں کی تعمیر و تزئین ہوتی ہے۔ امجد کے ڈرامے دیکھنے سے یہ حقیقت کُھل کر سامنے آتی ہے کہ ہر تخریبی عمل اور جرم کا کُھرا کسی وڈیرے کے ڈیرے تک پہنچتا ہے۔ امجد نے اقبالؔ کی اس نوا کو بڑی کامیاب متحرک بصری جہت

عطا کی ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

پروین شاکر نے اپنے محبوب کے بارے میں جو بات کہی تھی، شاعری بھی امجد کے بارے میں وہی بات بڑے وثوق سے کہہ سکتی ہے ـــ جب بھی وہ لوٹ کے آیا تو مرے پاس آیا۔ امجد کو اپنی جملہ حیثیتوں میں جو حیثیت سب سے زیادہ عزیز ہے وہ اس کا شاعر ہونا ہے۔ بلاشبہ اس نے اپنی اس تخلیقی استعداد کو اپنی دیگر حیثیتوں سے بڑھ کر منوایا ہے۔ اس کی کثیرا لجہت فنی مصروفیات کے باوصف شاعری جب اس کی توجہ مانگتی ہے تو وہ لپک کر اس کی طرف آتا ہے۔ اب تک اس کے سات شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔برزخ' ساتواں در' فشار' اس پار' ذرا پھر سے کہنا' آنکھوں میں ترے سپنے اور سپنے بات نہیں کرتے۔ 'خزاں کے آخری دن' کے نام سے اس کا کلیات بھی شائع ہوچکا ہے۔ اس کلیات کے بعد بھی آگے چلنے کے لئے وہ دم لینے کا قطعاً روا دار نہیں۔ اس کا یہ سفر جاری ہے۔ اس کا ایک اور شعری مجموعہ 'اتنے خواب کہاں رکھوں گا' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے اور اس نے 'بارش کی آواز' کا مژدہ بھی سنا رکھا ہے۔

امجد کے آہنگِ شعر کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہے۔ اس کا کلام کاغذ پر بھی بڑا معتبر ہے اور مشاعرے میں بھی خوب چمکتا ہے۔ عوام بھی اس پر جھومتے ہیں اور خواص بھی۔ اس کا ساغرِ سخن دل موہ لینے والے رسیلے پن سے چھلکتا ہے۔ اس کی جِدّت پسندی طرحِ نو کی شیدائی ہے۔ فرسودگی اور یبوست زدہ کہنگی کے خلاف وہ ایک سنبھلا ہوا مزاحمتی اور انقلابی روّیہ رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی شاعری میں اس کے اس روییّے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"امجد نوجوان نسل کے سبھی حسّاس اور ذہین شعرا کی طرح باغی ہیں مگر ان شعرا کے برعکس اپنی بغاوت کی باگیں ان کے اپنے شعور، اپنی قوّتِ فیصلہ اور اپنی دیانت کی گرفت میں ہیں۔ ان کی بغاوت تو دماغ و دل اور فکرو احساس سے پھوٹتی ہے"

امجد کی شاعری کے فکری اجزائے ترکیبی پر بات کرتے ہوئے قاسمی صاحب مزید یہ تبصرہ کرتے ہیں۔

"امجد ایک ایسا شاعر ہے جو اپنی دھرتی سے غیر مشروط پیار کرتا ہے۔ وہ بیراگی نہیں بلکہ اپنے معاشرے، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ سے مربوط ہے اس لئے مضبوط شخصیت رکھتا ہے اور مسائل پر سوچتا ہے، فکر کرتا ہے، جستجو کرتا ہے۔ خواہش کے اسمِ اعظم نے اسے وہ شاعرانہ بصیرت عطا کی ہے جو آج کی شاعری کا مستقبل معیّن کر رہی ہے۔"

محبّت اور وقت امجد کی شاعری کے اساسی موضوعات ہیں۔ شہزاد احمد اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔

"امجد اسلام امجد کو بنیادی طور پر ایک رومانوی شاعر کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا مرکزی مسئلہ محبّت ہے۔ محبت اس کے نزدیک بیک وقت اجاڑ دینے والی اور آباد کرنے والی شے ہے مگر اس دوہرے روّیے کے باوجود ہر شے پر محیط ہے ــــــ امجد کے لئے وقت کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا مسئلہ ہے۔ محبت کے بعد شاید سب سے زیادہ اس نے اسی موضوع پر لکھا ہے۔" فیض احمد فیض صاحب نے "ساتواں در" کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نظمیں بہت خلوص اور سہولت سے لکھی گئی ہیں۔ امجد کے بلیغ استعاراتی اظہار کی داد دیتے ہوئے اختر حسین جعفری مرحوم نے بھی ایک خط میں امجد کو ایسی ہی بات لکھی تھی۔

"میرے نزدیک اظہار کے مشکل ترین مراحل سے بسہولت گذر جانا اور اس سفر میں سہولت کو اس تسلسل سے جاری رکھنا کہ وہ فن کا غالب حصّہ بن جائے کمالِ ہنر کی سب سے بڑی اور ناقابلِ تردید گواہی بن جاتا ہے۔"

فیض صاحب اور جعفری صاحب نے اپنے اپنے تبصرے میں جو 'سہولت' کا لفظ استعمال کیا ہے وہ انتہائی خیال انگیز ہے اور یہ سہولت اسوقت پیدا ہوتی ہے جب صریرِ خامہ میں نوائے سروش گھل مِل جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے لوگوں کی کاوش میں قدرت اپنی نوازش کا ڈھیر سارا حصّہ ڈال دیتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری 'برزخ'

پر اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"برزخ کا شاعر ہر قسم کی فرسودہ 'بے جان' گھسی پٹی 'مہلک' مصنوعی اور حیات سوز روایت کا باغی ہے ۔ زندگی کی اَبدی سچائیوں اور مثبت قدروں سے امجد کے فکروفن کا رشتہ بہت استوار ہے ۔ یہ رشتہ اس کے یہاں ماضی 'حال اور مستقبل کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرکے دیکھنے 'ان کی پہنائیوں میں جھانکنے اور ان میں موجود حیات امکانی کو گرفت میں لینے کا ذریعہ ہے ۔" امجد کی شاعری کی سمت کا تعیّن کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان کی رائے یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی جنگ میں امجد غیر جانبدار نہیں بلکہ نیکی کے ساتھ ہر طرح اور ہر مرحلے میں Committed ہے۔

'ساتواں دَر' پر فتح محمد ملک صاحب کا اظہارِ خیال ملاحظہ فرمایئے۔

"امجد کی تمنّاوں کی کھیتی نسبتِ محمدیؐ سے ہری ہے۔ 'ساتواں دَرُ ہی نہیں بلکہ 'برزخ' کا آغاز بھی حمد' نعت اور سلام سے ہوتا ہے۔ یہاں پر حمد نعت وسلام اپنے گناہوں کے کفّارہ کے طورپر موجود نہیں بلکہ پوری تخلیقی شخصیت کی سرنوشت بن کر جگمگارہے ہیں ۔"

مشتاق شاد نے امجد کی شاعری کو بہت خوبصورت خراج تحسین پیش کیا ہے:

خیال وفکر کی رعنائیوں کا شاعر ہے
وہ اپنے عہد کی دانائیوں کا شاعرہے

امجد کی تنقیدی کتاب 'نئے پرانے' کو ڈاکٹر سلیم اختر نے تنقید کا ایک نیا زاویہ قرار دیا ہے جس کے مطالعے سے امجد کی جمالیاتی حِس 'شعری ذوق اور شعورِ نقد کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کتاب اپنے ضمنی عنوان 'کلاسیکی شعرا پر نئی نظر اور انتخاب' سے پورا پورا انصاف کرتی نظر آتی ہے ۔ یہ انتخاب مروّج انداز یا پیانہ سے قدرے ہٹ کر ہے اور ماضی کو حال اور مستقبل کے تناظر میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے ۔ شہزاد احمد کے بقول اس انتخاب کے دو حوالے ہیں ۔ ایک ماضی سے رشتہ استوار کرنے کا اور دوسرا فردا کے اتھاہ اندھیرے میں چھلانگ لگانے کا ۔ اس

کتاب میں تنقیدی تعارف کے بعض فقرے امجد کی حسِ نقد، حسِ مزاح اور ہنرِ مکالمہ نگاری کا دلچسپ امتزاج ہیں۔ ممتاز مفتی تو اس حسِ مزاح کو نثر کے پودے کا پھول قرار دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر تین فقرے ملاحظہ فرمایئے۔

"میر کا پرابلم یہ ہے کہ اس کی دستار ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے"

"سودا ہماری کلاسیکی شاعری کا پرابلم چائلڈ ہے۔"

"نظیر اکبر آبادی ایک اعتبار سے اُردو شاعری کا مجہّز تعلق ہے۔"

امجد کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے 'عکس' کے نام سے فلسطینی مزاحمتی شاعری کا اُردو میں بہت خوبصورت منظوم ترجمہ کیا ہے۔ فلسطینی شاعری کا یہ زرمیہ اور رجزیہ لہجہ فلسطینی عوام کے جذبہ حُریت، انکی جدّوجُہد اور خود امجد کے حُریت پسند اور استحصال شکن روّیئے کی ترجمانی ہے۔

امجد کے منظوم تراجم کا نقشِ ثانی 'کالے لوگوں کی روشن نظمیں' کے نام سے شائع ہوا۔ بقول شہزاد احمد یہ امجد کی سب سے غیر معروف کتاب ہے مگر اپنے طور بہت اہم ہے۔ یہ نظمیں سیاہ فام لوگوں کا ایک کرب آمیز نعرۂ حُریت ہے اور ضمیرِ عالم کی ایک ایسی آواز ہے جو تیسری دنیا کے لوگوں کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ان نظموں کے تراجم کا انتساب امجد نے کتنے روشن لفظوں سے کیا ہے۔

"اس لمحے کے نام جب حضرت بلالِ حبشیؓ نے کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر پہلی اذان دی تھی"

آج کل منفرد شادی وہ ہے جس کی ویڈیو نہ بنائی جائے، امتیازی مشاعرہ وہ ہے جو بین الاقوامی نہ ہو، ممتاز ادیب اور شاعر وہ ہے جو سمندر پار سے ہو کر آئے اور سفر نامہ نہ لکھے۔ لیکن صحبت کا اچھا یا برا اثر ہو کر رہتا ہے۔ شاید۔ صحبت میں قاسمی کی پڑی ہے اسے یہ خُو۔ کہ 'شہر در شہر' اور 'ریشم ریشم' کے نام سے دو سفر نامے لکھ چکا ہے۔ اب چونکہ یہ حرکت وہ کر بیٹھا ہے تو کیوں نہ اس کے اس جوہر کی پہچان کسی جوہری سے کروائی جائے؟ چلئے مشفق خواجہ عرف خامہ بگوش سے پوچھتے ہیں کہ وہ شہر در شہر کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

" امجد نے یوسفی صاحب کے مشورے پر عمل نہ کرکے بہت اچھا کیا۔ اگر خدا نخواستہ وہ اس مشورے کو قبول کر لیتا تو اُردو ادب ایک خوبصورت سفرنامے سے محروم رہ جاتا۔ اس سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ امجد نے بس اپنے سفر کے حالات، سفر کے دوران اپنی ذہنی کیفیات بیان کرنے اور گرد و پیش کی تصویر کشی تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ سفرنامہ نہیں پڑھ رہا بلکہ امجد کے ساتھ خود سفر کررہا ہے ——امجد کی طبع کی روانی ہی اس کی نثر کی روانی بن جاتی ہے جس کے ساتھ قاری خس و خاشاک کی طرح بہتا چلا جاتا ہے۔"

امجد اور عطاء الحق کاسمی کی باہمی صحبت کا ایک دوسرے پر ایک عجیب اثر یہ پڑا ہے کہ عطا ڈرامہ نگاری کی طرف چل نکلا ہے اور امجد کالم نگاری کی طرف۔ یہاں تک کہ کالموں پر مشتمل 'چشمِ تماشا' اور 'کھٹّے میٹھے' اس کے دو مجموعے مرتب ہو چکے ہیں۔ ان کالموں کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان میں حالاتِ حاضرہ سے آگاہی، تجزیے کی صلاحیت، حکّامِ بالا کو خبردار کرنے کی جسارت، درد مندی اور حق وانصاف کی پاسداری کے ساتھ شگفتگی کا عنصر بھی بدرجہ اَتم موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کالم سے اس سے زیادہ توقّع کرنا کالم کی حدود سے تجاوز ہوگا۔

امجد کی شخصیت کے بارے میں ضمیر جعفری صاحب کے زعفرانی قلم کی روانی دیکھیے۔

" اب وہ کتاب سے نکل کر ذہن میں داخل ہو چکا ہے۔ اپنی ذات کا کولمبس۔ خیالات کا محشرستان—— امجد۔ بلکہ امجد ستان——جس کا اپنا ایک جغرافیہ ہے۔ جس کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ موسم بارہ مہینے گلابی ہے۔ دھوپ کا ملک ہے۔ دُھند کا نہیں—— پہاڑوں کا سلسلہ چٹّا کالا پہاڑ کہلاتا ہے جس کے پہاڑ عموماً" گُل و گیاہ سے ڈھکے ہوئے ہیں—— جس کی اونچی چوٹی الف ننگی ہے۔ عموماً لطیفے پھینکتی ہے۔ لیکن کبھی لاوا بھی پھینکنے لگتی ہے—— امجد ستان میں تتلیوں اور پھولوں کا ہجوم ہے۔ حدِ نگاہ تک۔ اُودے اُودے نِیلے نیلے۔ پِیلے پِیلے پیرہن—— میں سوچتا ہوں اگر

امجد ستان میں کبھی انتخاب ہوئے تو اس کی پارلیمنٹ تتلیوں کی پارلیمنٹ ہوگی ۔"

امجد کا اپنا ایک مقولہ ہے کہ آدمی کو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں ۔ ماشاء اللہ وہ اپنا منہ بھی ہمہ وقت کھلا رکھتا ہے ——کھانے کے لئے ' باتیں کرنے کے لئے اور لطیفے سنانے کے لئے ۔ باتونی وہ اتنا ہے کہ اس سے ملنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ شخص سوچتا ' پڑھتا اور لکھتا کس وقت ہے ؟ لطیفوں کی تو وہ ایک آبشار ہے۔ پروین شاکر نے اپنے اس پیارے بھائی کے لئے کتنا درست تھا۔

" امجد اسلام امجد میں سے اگر لطیفے نکال دیئے جائیں تو کچھ زیادہ امجد باقی نہیں بچتا ۔ لیکن جو بھی بچتا ہے وہ ایسا ہے کہ اسے بچابچا کے رکھا جائے۔"

امجد کھانے پینے کے سلسلے میں پرہیز سے بڑی پرہیز کرتا ہے۔ کھانے کی میز پر کسی قسم کی دال بھی موجود ہو تو کھانے کو بڑا مدلّل قرار دیتا ہے۔ اِدراک اسے اللہ نے وافر مقدار میں عطا کیا ہے۔ اَدرک کا بندوبست وہ خود کرلیتا ہے کہ اسے بہت ہی پسند ہے۔ یہاں تک کہ انڈے کے آملیٹ کو بھی اَدرک کے بغیر نامکمل سمجھتا ہے ۔ مچھلی اور دہی اور دہی کے جملہ متعلقات سے سخت کراہت محسوس کرتا ہے ۔ یہاں تک لسّی جیسی اُجلی اُجلی بنتِ شِیر سے بھی کوئی رغبت نہیں رکھتا ۔ پیپسی' کوکا کولا اور سیون اَپ کِنگ سائز بوتل سے پیتا ہے ۔ اس کی اس حرکت پر ہماری بھابی فردوس اسے بہت غصّے کی نظر سے دیکھتی ہیں ۔ ان کے غصّے پر اس کو جو غصہ آتا ہے اُسے بھی پی جاتا ہے ۔ بعض ایسے کام جو وہ بالکل نہیں کرتا ان میں سگرٹ نوشی بھی ہے اور دوپہر کی استراحت بھی ۔پوشاک کے سلسلے میں امجد کو CREASE کا کوئی CRAZE نہیں ہے ۔ وارڈ روب کی طرف ہاتھ بڑھایا جو لباس بھی آسانی سے ہاتھ آیا پہن لیا' پہن کر لیٹ گئے اور پھر اسی سے مشاعرہ بھی پڑھ آئے ۔ امجد جو کچھ بھی لکھتا ہے لیٹ کر لکھتا ہے۔ لیٹنا اس طرح ہے کہ گھٹنوں سے میز کا کام لیتا ہے ۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ دکھایا جارہا ہو تو اس کی نگاہیں ٹی وی کی سکرین سے سِل جاتی ہیں ۔ اس کھیل کو وہ اس محویّت سے دیکھتا ہے کہ ــــ اس کا دیکھنا دیکھا نہ جائے ! ایک جیتا جاگتا انسان مجسمہ بن کے رہ جائے ! آخر کیوں ؟ کسی زمانے میں وہ خود بھی کرکٹر بننا چاہتا تھا ۔ اللہ کے فضل

سے بال بال بچ گیا ہے۔ خط اس کا صاف ستھرا ہے اور قاری پر خوشگوار اثر چھوڑتا ہے۔ اپنے دستخط کی خوبصورتی کی داد تو وہ صادقین سے پا چکا ہے۔

امجد کے ڈرامے دیکھئے، اس کی شاعری سنئے 'اسکے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیجئے' اسکے کالم اور تراجم پڑھئے' اس کے سفرناموں کے وسیلے سے شہر در شہر کی سیر کیجئے تو اس کے دریائے تحریر کی ساری موجوں کی روانی میں محبّت کے پھیلاؤ کا ایک دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری پہنائیاں محبّت کے ایک لفظ کی گرفت میں ہیں - اور ایٹمی پھیلاؤ کے اس دور میں محبّت کے پھیلاؤ کی جو افادیت اور اہمیّت ہے اس سے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(ادبی انجمن جناح کمیونٹی ڈیویلپمنٹ سوسائٹی برنلے لنکا شائر کے زیرِ اہتمام امجد اسلام امجد کے ساتھ ایک شام میں پڑھا گیا)

خاقان خاور اور اُس کی غزل

خاقان خاور کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب اُسکی شاخِ طبیعت پر شاعری کی کونپل نئی نئی پھوٹی تھی۔ دھیماپن اور اختصار آمیز گفتار اسکے مزاج کا خاصہ ہے۔ عقلِ عام جیسی نایاب چیز اسے دافر مقدار میں ملی ہے۔ حالات اور واقعات کی رفتار کو بھانپ لینے کی اس میں زبردست صلاحیت پائی جاتی ہے۔ غزل کی کوئی مشکل بحر ہویا زندگی کا کوئی مشکل مقام ، نہ اسکے اوزان خطا ہوتے ہیں اور نہ اوسان ۔ضبط اور ہوشمندی ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔گھر کی سطح سے لیکر عالمی سطح تک اس دور کے ہر کرب کواس نے شدّت سے محسوس کیا ہے۔ہر غیرمعقول روِش اسکی روح کو مجروح کرتی ہے لیکن اسے مزاج ایسا ملا ہے کہ دمِ گفتگو وہ جذبات کے مُتند شعلوں

کو سُلگتی ہوئی اگر بتی کی صورت میں ڈھال دیتا ہے۔

خاور میرا بچپن کا دوست ہے۔ایک حکیم کا قول ہے کہ 'میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ میں اسکا دوست ہوں لیکن میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی میرا دوست ہے۔' لیکن خاقان خاور کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دوستی کا معیار ہے۔غالب نے کہا تھا

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اگر اس مصرعے سے طنز کا پہلو نکال دیا جائے تو یہ مصرع خاور پر ہُوبہو صادق آتا ہے۔وہ جس کا دوست بنتا ہے اسکے لئے آسمان کے سامنے ڈھال بن جاتا ہے۔خیالِ خاطرِ احباب اسکے لئے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ مجھے اس سے صرف یہی گلہ ہے کہ مجھے اس سے کوئی گِلہ کیوں نہیں ہے؟

میرا جی چاہتا ہے کہ اگر عمرِ رفتہ کو آواز دی ہے تو اس دور کی کچھ اور باتوں کا تذکرہ بھی کرتا چلوں ۔خاور سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ اس زمانے میں خاقان خاور نہیں بلکہ اعجاز سرور تھا اور اپنے گھر اور گلی محلے میں "ججّی" کے نام سے مشہور تھا۔مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب اعجاز سرور کو اپنے لئے ایک اچھّے سے تخلّص کے انتخاب کا مسئلہ در پیش تھا۔ وہ اپنے لئے کوئی ایسا روشن تخلص انتخاب کرنا چاہتا تھا جس کے معنی آفتاب کے ہوں اور لفظِ خاور اسے بہت پسند تھا۔اسکی اس پسند کے پیشِ نظر میں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر خاور کے ساتھ خاقان کا سابقہ لگ جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔میرا یہ مشورہ اس نے اتنی خوشدلی سے قبول کیا کہ آج تک اس پر قائم ہے۔ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب زندگی میں پہلی مرتبہ میری اور خاور کی غزلیں زمیندار کالج کے میگزین 'شاہین' میں شائع ہوئی تھیں تو ان دنوں ہم گجرات کے مسلم بازار سے اس طرح گذرتے تھے جیسے سارے گجرات کو معلوم ہے کہ ہماری

غزلیں شائع ہو چکی ہیں- آج یہ بلت کتنی عجیب سی لگتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

عجیب لطف تھا نادانیوں کے عالم میں
سمجھ میں آئیں تو باتوں کی لذتیں بھی گئیں

خاور کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی پریشانیوں کا کبھی اظہار نہیں کرتا اور دوسروں کے دکھ درد اسطرح سنتا ہے کہ جیسے وہی اسکے اپنے دکھ درد ہوں۔اظہارِ ذات اور نمود ونمائش سے سخت گریزاں ہے یہاں تک کہ اپنے شعر سنانے سے بھی اسے وحشت ہوتی ہے۔اب اسکی کتاب چھپی ہے تو بہت سے ایسے لوگوں کے لیے اس کا شاعر ہونا ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے جن سے اسکی برسوں کی دوستی ہے۔خاور کے اندر ایک قلندر رہتا ہے جوانسان دوستی ' بے لوثی اور بے نیازی کا مرقّع ہے۔

ایک سخن گو کی حیثیت سے خاور ابہام سے سخت گریزاں ہے۔اس نے اپنے اور قاری کے درمیان شعریت کی باریک چلمن کے سوا اور کوئی پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔الجھاؤ اسکے مسلکِ شعر میں ناروا ہے۔ شعر اسکے نزدیک ریاضی کا سوال نہیں لوحِ دل پر بے ساختہ ثبت ہوجانے والی مقدّس عبارت ہے۔خاور کی سادہ بیانی دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جولوگ ابہام اور پیچیدگی میں کھوگئے ہیں شاید وہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتے یاپھر سادگی سے بات کرنا انتہائی دشوار ہے۔زندگی کے سادہ حقائق کوسادگی سے بیان کرنا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن زندگی کی پیچیدگیوں کو سادہ اسلوب میں ڈھال دینا واقعی ایک کمال ہے اور خاور نے یہ کمال کر دکھایا ہے۔

خاور کی طبیعت کا ایک اور امتیازی رجحان یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی زمانے کی عام روش اور ڈگر پر چلنے سے انکار کرتا رہا ہے۔اسکی عزتِ نفس پامال راہوں پر چلنے سے گریزاں رہی ہے-وہ ہمیشہ زمانے کے نوبہ نو تقاضوں کا ساتھ دینے اور جدید طرز

فکرو احساس کو اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنانے کا علمبردار رہا ہے۔اسکے حریمِ شعر میں کسی غیر کی خودی کا کہیں گذر نہیں۔ اپنی شاخ پر اپنا پھول کِھلانا اس کا مسلک ہے اسی اُفتادِ طبع کا نتیجہ ہے کہ وہ غزل کے میدان میں ایک منفرد سادہ بیانی لے کر آ ہے جو باہر سے خنک خنک اور اندر سے کھولتی رہتی ہے۔

خاور کے مزاج کاایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ مسائل کی تہہ تک اترنے کا عادی ہے۔اسکے یہاں معاشرتی الجھنوں کے اسباب و عِلَل دریافت کرنے' دور اندیشی کی پیش بندیوں کا اہتمام کرنے اور معاملاتِ زندگی میں دانائی سے کام لینے کا واضح رجحان ملتا ہے۔مسائل سے وہ آنکھیں نہیں چُراتا بلکہ انکا حل ڈھونڈنا چاہتا ہے۔اپنے اندر بھی جھانکتا ہے۔کھڑکی کھول کر باہر بھی دیکھتا ہے۔اس نے روشِ عام سے ہٹ کر دوسروں کے حوالے سے اپنی بات کرنے کے بجائے اپنے حوالے سے دوسروں کی بات کی ہے۔

خاور کی غزل شجر کے ساتھ لپٹی ہوئی بیل کی طرح ہے۔ اس لئے کہ پیڑ اس کے ہاں کلیدی لفظ ہے۔ موجودہ دور کے غزل گو شعراء کے یہاں درخت ایک عام استعارہ ہے لیکن خاور کی شاعری میں اس نے ایک خاص حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کے مجموعے میں کوئی ایسی غزل نہیں ہے جس میں پیڑ یا اس کے متعلقات کا ذکر نہ ہو۔ یتیمی کے داغ سے لے کر اب تک کے سارے سفرِ زیست اور ساری ذہنی اور قلبی واردات کو اس نے اسی علامت کے وسیلے سے بیان کیا ہے۔ پیڑ اس کے یہاں زندگی کے سارے رنگوں اور ذائقوں کا مظہر ہے۔ تمنّا بھی ہے اور مرگِ تمنّا بھی' فرد بھی' معاشرہ بھی' محبت بھی' وحشت بھی' بھری بہار بھی' کربِ تنہائی بھی اور کھوکھلا پن بھی۔ غرض زندگی کی ساری دھوپ چھاؤں کا حوالہ خاور کے یہاں صرف پیڑ ہے۔

ٹوٹے پتّوں کو شجر یاد آیا
ٹھوکریں کھائیں تو گھر یاد آیا

جب کسی پیڑ پہ پتّھر برسے
مجھ کو نیکی کا ثمر یاد آیا

اُونچے درخت بھی کئی جڑ سے اُکھڑ گئے
سیلاب لے گیا سبھی تنکے بہا کے ساتھ

کچھ تمنّائیں خاک بھی ہوں گی
کب اُگے ہیں یہاں شجر سارے

کس کو خبر ہے پیڑ سے ہو دور
کون سا پتّا کب ٹوٹے گا

خاور کا بچپن دردِ یتیمی کی ٹیس ہے۔

سارے جہاں کی دھوپ مرے گھر میں آگئی
سایہ تھا جس درخت کا مجھ پر وہ کٹ گیا

جب یہ سہانی چھاؤں دفن ہوئی تو خاور کو یوں لگا جیسے اس کی ذات کا آئینہ ٹوٹ گیا ہے اور پھر یہ اندوہناک لمحہ خاور کے لئے ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا۔

دل کے صحرا میں ہے اک لمحہ ابھی تک ساکن
لاکھ دریا کی طرح وقت رواں رہتا ہے

محبتوں کے سراب خاور کو اور بھی تشنہ کر گئے اور اُسے ایسی تنہائی دے گئے کہ وہ درختوں سے لپٹ لپٹ کر رویا اور اسی لمحے نے اس کے ذہن سے گھر کا تصوّر چھین لیا ہے۔

کس نے رکھّا ہے مرے سر پہ کبھی دھوپ میں ہاتھ
چھت جو ہوتی تو مرے گھر میں بھی سایہ ہوتا

کیا سوچ کے فٹ پاتھ پہ آ بیٹھے ہو خاورؔ
ایسی ہی تھکاوٹ ہے تو گھر کیوں نہیں جاتے

لیکن خاور کے اس دکھ نے اس کے دل میں دھوپ میں جُھلتے ہوئے سارے انسانوں کے لئے دردمندی اور ہمدردی کی جوت جگا دی ہے۔

اپنے تلخ تجربوں کی بنیاد پر خاور نے زندگی کا جو تجزیہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ زندگی اذیّتوں کی تکرار ہے۔ زمانہ ایک دکھ بھری کہانی کو دہرائے چلا جا رہا ہے اور یہ دکھ اس لئے جنم لیتا ہے کہ انسان وقت کے سیلِ بے پناہ کے سامنے انتہائی بے سکت ہے۔ تنکے کی اوقات ہی کیا ہے؟ کِشتِ ہستی کا حاصل صرف اور صرف بے حاصلی ہے۔ زندگی بکھرنے کا عمل ہے۔ اگلے لمحے کا SUSPENSE انتہائی جان لیوا ہے۔

جنگل کا لفظ خاور کے یہاں پیڑ کے پھیلاؤ کی ایک بھیانک صورت ہے اور موجودہ معاشرے کی تصویر جس میں ہر شخص خوف و ہراس کے پنجے میں ہے۔ فاختائیں چیلوں کا شکار ہیں اور غزال چیتوں اور بھیڑیوں کی زد میں۔ اونچے مکانوں نے نیچے مکانوں کو دھوپ اور روشنی سے محروم کر رکھا ہے۔ اجناس ذخیرہ در ذخیرہ ہیں لیکن ضرورتیں پھر

بھی سسکتی رہتی ہیں۔

میلوں میں پھیلتے گئے پودے کپاس کے
محتاج کتنے لوگ ہیں پھر بھی لباس کے

خاور سچّی باتیں کہنے کا عادی ہے۔ سچائی کے لئے وہ شعلوں میں کود جانے کے لئے بھی تیّار ہے۔ سوچنے کا اسے آزار لاحق ہے۔

اوّلیں تنہائیوں میں سوچنے کو کچھ نہ تھا
اور اب سوچوں کی دلدل میں زمانے ہو گئے

اپنی سوچوں کے حوالے سے وہ پورے معاشرتی اور ازلی اور ابدی جبر کے بارے میں سوچتا ہے۔ اگر کیوں کا مطلب لڑائی ہے تو خاور اس محاذ پر ڈٹا ہوا ہے اور سوال پر سوال کئے جا رہا ہے۔

اک بار ہی طوفان گذر کیوں نہیں جاتے
ہم کو ہے بکھرنا تو بکھر کیوں نہیں جاتے

جیون بھی اگر ایک سفر ہے تو بتاؤ
ٹھہرے ہوئے لمحات گذر کیوں نہیں جاتے

کیا سوچ کے یہ لوگ رواں ہیں مرے پیچھے
انجام مرا دیکھ کے ڈر کیوں نہیں جاتے

اولاد اس کی دیکھ کے یہ سوچتا ہوں میں
کیوں نیکیوں کے پیڑ کو کڑوے ثمر لگے

کیوں کاٹ رہے ہو مجھے بیکار سمجھ کر
بے پھل ہی سہی سایہ تو پھیلاؤں گا میں بھی

شاید اس دور میں خاور کے سوا اور کوئی غزل گو ایسا نہیں ہے جس کے یہاں بچّے اور بچپن ایک باقاعدہ موضوع کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس مضمون کو وہ براہِ راست بھی چھیڑتا ہے اور بالواسطہ بھی۔ چاند، تتلی، جگنو، کبوتر اور پھول کے الفاظ وہ اس پیرائے میں استعمال کرتا ہے جیسے بچپن کو آواز دے رہا ہو۔ بچپن کی بے لوث فضاؤں کی یاد اس کے یہاں ایسے ہے جیسے کچھ دیر کے لئے سائے میں ستانے کا عمل۔ اس کے بیشتر شعروں کی فضا بھی ایسی ہے کہ ان کے مفہوم کے پیچھے قاری کا ذہن اس طرح دوڑنے لگتا ہے جیسے بچّہ تتلی کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ اب اس شعر کو سوچتے چلے جایئے۔

کیا جانئے کیا ٹوٹ گیا بیٹھے بٹھائے
خاموش فضاؤں میں یہ کیا شور اُٹھا ہے

ان بچّوں کو دیکھ کر خاور کا دل بے طرح پگھلنے لگتا ہے جن کے کمزور کندھوں پر مفلسی کا بوجھ آن پڑا ہو۔ وہ ایسے ننّھے ننّھے ہاتھوں پر خارِ محنت کی خراشیں دیکھ کر تڑپ ہے جنکی کمائی کھانے والے اتنے ہاتھ ہیں کہ شمار نہیں کئے جاسکتے۔ یوں لگتا ہے ایسے ہر کمسن کے ساتھ وہ اپنے دردناک تجربے کا اعادہ کرتا ہے۔

اس پھول سے بچّے پہ ہے کُنبے کا گذارہ
اک کوہِ گراں ٹوٹ پڑا ننّھی سی جاں پر

خاور کی غزل کے حوالے سے بچپن کا موضوع پھر چھڑ گیا ہے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ خاور بچپن میں بہت ہی سنجیدہ تھا۔ اس لئے مجھے اس کی کوئی شرارت بھی یاد نہیں ہاں البتہ اتنا یاد ہے کہ اس زمانے میں اس نے ایک ایسا شعر ضرور کہا تھا جس میں

شرارت کا لفظ آتا ہے۔ وہ شعر اس کی کتاب میں شامل نہیں ہے لیکن مجھے اب تک یاد ہے اور اس موقع پر ضرور سناؤں گا اس لئے کہ اس شعر میں وہ چکنے چکنے پات صاف دکھائی دیتے ہیں جو ایک ہونہار بروا کے ہوا کرتے ہیں اور وہ شعر یوں ہے۔

میرے احساس کی شرارت ہے
ورنہ حالات کوئی چیز نہیں

احساس کی یہ شرارت رفتہ رفتہ خاور کے ہاں ایسی شدّت احساس کی صورت اختیار کر گئی کہ

وہ کہتا ہے کہ اس نے بات کی ہے
میں کہتا ہوں مجھے خنجر لگا ہے

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خاور نے اپنی ٹیسوں پر ایک ایسا SILENCER چڑھا رکھا ہے جس نے اس کی غزل کو ایک انتہائی خوشگوار اور شائستہ آہنگ میں بدل دیا ہے۔ اس دور میں بے صبری ایک عام ردِّ عمل ہے۔ چیخیں مار کر چونکانا ایک رسم بن گئی ہے اور آج کوئی ہنرِ زیبا بھی اس اوچھے پن سے محفوظ نہیں۔ یہی آشفتہ سری جدید فنِ موسیقی میں پاپ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اس پاپ سے میں خاور کی ایک غزل ایک معصوم سا سخنِ زیرِلبی ہے۔ نہ جانے کتنی مدّتوں سے کتنے خیالات اس لئے مارے مارے پھر رہے تھے کہ کوئی انہیں معصومیت کا لباس عطا کرے اور یہ ردائیں انہیں خاور کے یہاں سے میسّر آئی ہیں۔ یہی معصومیت اس کی غزل کی جان بھی ہے اور پہچان بھی۔ مجھے تو اپنے اس لہجے میں وہ بالکل تجا دکھائی دیتا ہے۔ کیا یہ لہجہ معصومیت کی انتہا نہیں ہے۔

گُل کو گُل ڈالی کو ڈالی کہتے ہو
تم بھی خاؔور بات نرالی کہتے ہو

لیکن اس معصومیت میں کیسی تلخی اظہار پا گئی ہے۔

فن کے بارے میں ہزاروں باتیں کہی گئی ہیں اور کہی جا سکتی ہیں لیکن اس سلسلے میں سو بات کی ایک بات یہی ہے کہ آرٹ دراصل پیشکش کا نام ہے اور خاص طور پر غزل گوئی کا ہنر ایسے اُسلوب کا متقاضی ہے کہ اس میں گفتہ سے زیادہ ناگفتہ ہونا چاہئے۔ آواز خوشبو کی طرح چھیڑ جائے تو غزل کہلاتی ہے۔میرے نزدیک خاور کی غزل اسٹائل کے اعتبار سے خوشبو کا جھونکا ہے۔

خاقان خاور اپنے ہی ایک مصرعے کی تجسیم ہے

اک پیڑ سرِراہ کھڑا سوچ رہا ہے

اپنی تنہائی، بے منزلی، بے حاصلی اور معاشرتی کرب کے شدید احساس کے باوجود اس کا ضبط اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ اس طوفان میں اس کی حویلیِ جاں مضبوط ہے اور اس نے اپنے توازن کو بگڑنے نہیں دیا۔ اس کی نظر پتھر میں کھلے ہوئے پھول پر پڑتی ہے تو اسے مایوسیوں سے بچا لیتی ہے اس کے یہاں یہ مثبت زاویئے نہ ہوتے تو نہ جانے اب تک وہ شکست کے کس مرحلے میں ہوتا۔ اس کی سوچوں نے زہرِحیات کو گوارا بنا لیا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک مجبوری ہے لیکن اچھی زندگی بسر کرنا ایک فن ہے۔

خاور کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے میں ایسے رسمی، مبالغہ آمیز اور روایتی جملوں سے پرہیز لازمی سمجھتا ہوں کہ خاور اس عہد کا ایک عظیم شاعر ہے اور 'بھنور کی آنکھ' ایک عہد آفریں کتاب ہے۔کیا یہ سیدھی سادی سی بات کم اہمیت رکھتی ہے کہ بھنور کی آنکھ سچے اظہار کی ایک نادر مثال ہے۔ اور خاور کی غزل ہو بہو خاور پر گئی

ہے۔

میں نے جس LIGHT موڈ میں اس مضمون کا آغاز کیا تھا جی چاہتا ہے اسی بے تکلفی کے انداز میں اسے اختتام تک پہنچاؤں اور سامعین کو اس بات سے بھی آگاہ کردوں کہ خاور نے پہلے اپنے اس مجموعے کا نام 'پتّوں کی برسات' تجویز کیا تھا اور کافی عرصہ تک اسے اس نام کے سلسلے میں نفسِ مطمئنّہ حاصل تھا لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ اختر امام رضوی نے اس نام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "کہ یار تم نے اپنے مجموعے کا یہ 'پتّوکی' کیا نام رکھا لیا ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ 'چیچو کی ملیاں' رکھ لیتے۔ بس اس دن سے خاور کا دل اس نام سے اُچاٹ ہو گیا۔

یہاں پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ میرا پسندیدہ شاعر اقبالؔ ہے اور خاور کا غالبؔ اور اس سلسلے میں ہماری پسندیدگیاں ٹکرا کر بارہا بحث کی صورت بھی اختیار کرتی رہی ہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب پیراڈاکس (Paradax) ہے کہ خاور نے اپنی کتاب کے لئے آخرکار جو نام تجویز کیا ہے وہ غالبؔ سے نہیں بلکہ اقبالؔ کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔

اُس مَوج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

جمّوں و کشمیر
(ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ)

پاکستان اور نظریہِ پاکستان سے پروفیسر احسان اکبر کی وابستگی مثالی ہے۔ ان دو نسبتوں کا دائرہ جہاں تک پھیلتا ہے احسان اکبر کی نظریاتی شخصیّت وہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ استعمار کی اس شب سیاہ میں اس کی خوش بینی سلامتی کی صبحِ درخشاں کو کسی دُھند کے بغیر دیکھ رہی ہے۔ اس نے نثری پیرائے میں دو عظیم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ یعنی فکرِ اقبال اور مسئلہِ کشمیر۔ وہ ان موضوعات کو ماضی کے حوالوں کے ساتھ ساتھ مستقبل کے تناظر میں بھی دیکھتا ہے۔ ان موضوعات سے اس کی دلچسپی بلاشبہ اس

کے بنیادی نظریاتی حوالے کا فیضان ہے۔ اسی لئے وہ اس خلوص اور دردمندی سے بات کرتا ہے کہ اس کی بات ذہن کو بھی مطمئن کرتی ہے اور دل میں بھی اُترتی ہے۔ اقبال کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ یہ صدی اقبال کی ہے اور آنے والی صدیاں تو بہرحال اسی کی ہیں ۔مسئلہ کشمیر کے جملہ اَبعاد کا جائزہ وہ اکیسویں صدی کے تناظر میں لے رہا ہے۔ صدیوں پر محیط باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جس کا تاریخی شعور مستقبل بنی کی استعداد کا حامل ہو۔ کشمیر کے ساتھ اس کو ایسا علاقہ ہے کہ وہ نظریاتی سطح پر اپنے آپ کو کشمیری کہتا ہے۔ خطِ متارکہ کے اس پار کشمیری نوجوانوں نے جہاد کا علم اٹھایا تو اوھر احسان اکبر نے ان کے نعرۂ تکبیر میں اپنی آواز شامل کرنے کے لئے قلم اٹھا لیا۔ بیک وقت اقبال اور کشمیر سے احسان کو اس لئے بھی محبّت ہے کہ یہ دونوں موضوع آپس میں بے حد مربوط ہیں۔ کشمیر اقبال کا آبائی وطن ہے ۔۔تنم گُلے زخیابانِ جنّتِ کشمیر ـــــ کشمیر کے حالِ زار پر اقبال کی روح آج بھی انتہائی بے چین ہو گی ۔ ہنوز چشمش تر انست کہ مُلکش با دگران است۔ اقبال انیس برس کا تھا کہ اس نے کشمیر پر پہلی نظم لکھی۔ پھر اس موضوع پر اس نے اُردو اور فارسی میں اتنے شعر لکھے ہیں کہ ان سب کو یکجا کر کے اور اُردو اشعار کا منظوم فارسی میں ترجمہ کر کے ڈاکٹر آفتاب اصغر نے 'ارمغانِ کشمیر' کے نام سے ایک پوری کتاب مرتّب کر دی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔ اقبال نے جب یہ کہا ـــ بریشم قبا خواجہ از محنتِ او۔ نصیبِ تنش جامہ تار تارے ـــ تو ڈوگرہ شاہی کے زمانے کی کشمیری مسلمانوں کی تصویر کھینچ کے رکھ دی۔ اقبال نے کشمیریوں کی زبوں حالی کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے حقوق کا دفاع بھی کیا۔ کشمیریوں کو اتحاد کا درس بھی دیا کہ کشمیر کے حروف کی طرح متحد ہو جاؤ۔ علاّمہ نے یہ بھی کہا کہ دینی اور تہذیبی اعتبار سے کشمیر ملّتِ اسلامیہ کا حصّہ ہے۔ اقبال کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ برف کے نیچے دبی ہوئی چنگاری ابھی افسردہ نہیں

ہوئی۔ اقبال کی ایک نظم میں غنی کشمیری اقبال سے پوچھتا ہے کہ اگر کشمیریوں کی خاک میں کوئی شرر نہیں تو یہ بتا تیرے سینے کا سوز کہاں سے آگیا ہے ؟

کشمیر کے سلسلے میں اقبال کی بے تابیوں کو احسان اکبر نے اپنے سینے میں اتار لیا ہے.... 'جموں و کشمیر ... ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ ' انہی بے تابیوں کا اظہار ہے۔ احسان اکبر کی آرزو ہے کہ پاکستانی بھی اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھیں اور اپنی غفلتوں کا ازالہ کریں۔ اس کے علاوہ ساری دنیا کو بھی اس کی نزاکت اور حقیقت کا احساس دلایا جائے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک لاعلمی اور بھارت نوازی کے زیرِ اثر اور کچھ غیر ملکی ایجنسیوں کے پروردہ لوگ ہماری بنیادی موقف سے ہٹ کر مسئلہ جموں و کشمیر کی جو مختلف تعبیریں کرتے ہیں ان کے اثرات کو زائل کیا جائے اور مجاہدین کی موجودہ تحریکِ مزاحمت کے پس منظر کو پوری صحّت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے۔

کشمیر فطرت کے حسن و جمال اور انسان کے حزن و ملال کی ایک دلخراش داستان ہے۔اس فردوسِ روئے زمین میں سکھوں، ڈوگروں اور موجودہ بھارتی حکومت نے پے در پے کشمیریوں پر ظلم کے وہ پہاڑ توڑے ہیں کہ استبداد کی ساری تاریخ ان خونریزیوں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اور یہ سارا خونیں ڈرامہ ملّتِ مسلمہ کے خلاف انگریز اور ہندو کی گھناؤنی ملی بھگت ہے۔وہی شرارِ بو لہبی کی ستیزہ کاری کا تسلسل۔اور پھر کشمیری مسلمانوں سے اپنوں کی بیگانگی، غیروں کی سرد مہری، عالمی درِ انصاف پر دستکوں کی بے اثری۔کوئی بھی توانگی فریاد کو نہیں پہنچا۔ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا۔کشمیری مظلوم کے لئے جب حرفِ تسلّی بھی نا پید ہوگیا۔جب اس نے محسوس کیا کہ وہ بالکل تنہا ہوگیا ہے تو اسکی سُلگتی ہوئی تنہائی شعلہ جوّالہ بن گئی اور وہ ظلم کے آگے اس طرح ڈٹ گیا جسطرح ایک مغلوب بلّی کُتّے پر جھپٹ پڑتی ہے۔اسی جھپٹ اور اسی شعلے کا

نام تحریکِ حُریّتِ کشمیر ہے۔۔۔ یہ صورتحال ستم کش اور ستم کار کے درمیان پیکار کا آخری معرکہ ہے۔مدّتوں سے ایک درد ناک اور پیمان افروز نغمہ بھی تو مظلوم کشمیریوں کو اس پیکار پہ آمادہ کر رہا ہے۔مرے وطن تری جنّت میں آؤں گا اکدن ۔۔جیسے فردوس سے بچھڑی ہوئی کوئی حور کرلا رہی ہو۔ڈاکٹر آفتاب اصغر نے فارسی میں اس ٹکڑے کا کیا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔۔ نگارِمن بہ بہشت تو میرسم روزے۔۔

حقیقت یہ ہے کہ بھارت تقسیم ہند کے ایجنڈے کی اس شق سے انحراف کا مرتکب ہوا ہے جو برِصغیر کی ۵۶۲ ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں تھی۔حیدر آباد،جونا گڑھ اور ٹراونکور کی ریاستوں کے بارے میں اسکا موقف اس موقف سے سراسر مختلف ہے جو اس نے ریاست جمّوں وکشمیر کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔سلامتی کونسل نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ ریاست جمّوں و کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ رائے شماری سے ہوگا اور عوام کو یہ حق دیا گیا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ریاست کا الحاق کس ڈومینین سے ہونا چاہیئے۔اس فیصلے کو بھارت اور پاکستان دونوں نے تسلیم کیا تھا۔یہی حقِ خودارادیّت ہے۔اس فیصلے میں کسی والیِ ریاست کی اپنی صوابدید یا ریاست کے آزاد اور خود مختار رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پروفیسر احسان اکبر کی یہ کتاب سلامتی کونسل کی قرارداد، کشمیریوں کے مبنی بر انصاف موقف اور مجاہدین کی انقلابی جدّوجُہد کی تائید اور بھارت کی غاصبانہ روش،کذب، دروغ اور کھلی دھاندلی کی پر زور تردید کرتی ہوئی ایک مدلّل دستاویز ہے۔ اس کتاب میں احسان اکبر نے کشمیر میں سکھوں کی حکومت، ڈوگرہ شاہی اور خاص طور پر بھارتی تسلّط سے لے کر حریّت پسندوں کی موجودہ تحریک تک اس مسئلے کے سارے پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔یہ مواد بڑی محنت اور جانکاہی سے جمع کیا گیا ہے۔ مصنّف نے بڑے تواتر اور تسلسل کے ساتھ اس مسئلے کا مطالعہ کیا ہے اوراس سلسلے

میں بے خبری کا ایک لمحہ بھی بسر نہیں کیا-یہ دستاویز بھارتی اور پاکستان لیڈروں کے بیانات ،ملکی اور غیر ملکی اخباروں اور رسالوں کے اداریوں اور تبصروں ،قراردادوں ،انٹرویوز، اقوامِ متحدہ کے چارٹر، تاشقند اور شملہ معاہدوں اور متعلقہ رپورٹوں کے متعدد اقتباسات پر مشتمل ہے-

احسان اکبر کا تجزیہ یہ ہے کہ بیگانوں کی روش تو دشمنی پر مبنی ہونی تھی لیکن ستم یہ ہے کہ - بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد- جنہوں نے خود آدھا پاکستان ہاتھ سے گنوادیا حصولِ کشمیر میں وہ کیا مدد کرسکتے تھے-بقولِ نظیری

تو بہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری

بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

احسان نے مسئلہ جموں وکشمیر کے بارے میں پاکستان کی حکومتوں کی ساری پسپائیاں اور بھارت کے سارے منفی اقدامات ایک ایک کر کے گنوائے ہیں- ہم نے بھارت سے بے سود مذاکرات کئے جن کا فائدہ بھارت کو پہنچا' ہم نے اقوامِ متحدہ سے رجوع کرنے میں غفلت سے کام لیا' میدان جنگ میں ہماری ہر پیشقدمی مذاکرات کی میز پر 'عقب ماندگی بن کر رہ گئی' ہم نے اپنے برادر مسلمان ممالک کو کسی فورم پر کشمیر کا مسئلہ اٹھانے سے خود روکا-یہی نہیں بلکہ ہماری حکومتیں بھارت کی کشمیر پالیسی کو تقویت پہنچانے کے جرم کی مرتکب ہوئی ہیں-ہم نے یہی کوشش کی کہ یہ مسئلہ ہمارے حافظے سے محو ہوجائے اور اگر "سہوا" کہیں کشمیر کا ذکر آ ہی جائے تو اسکے ساتھ جموں کا لاحقہ باقی نہ رہے-پاکستان کے اربابِ اختیار نے اس مسئلے میں سنگدلانہ بے حسی اور افسوسناک معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کئے رکھا اور حد یہ ہے کہ ہمارے سفارتخانوں کی کارکردگی میں لاعلمی کے ساتھ ساتھ خیانت کاری کا عنصر بھی شامل رہا ہے-اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ کتاب کشمیری مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھانے والے بھارت کے

سیکولرازم' جمہوریت مآبی اور متحدہ ہندوستانی قومیّت کا پردہ بھی چاک کرتی ہے۔اقوامِ متحدہ کی لاتعلقی' گاندھی' نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے مکروہ سازشی کردار' اس بھیانک کھیل میں نسوانی کرداروں کی اثر اندازی اور شیخ عبداللہ کی وہ خیانت کاری جس نے اسے ایسا ابلیسی کردار بنادیا ہے جو بنگال کے جعفر اور دکن کے صادق کے ساتھ ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔۔اس کتاب کے آئینے میں یہ ساری شرمناک تصویریں صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔

احسان اکبر کو ایقان حاصل ہے کہ کشمیر سے سیاسی اور عسکری طور پر بھارت کا پسپاہونا اس کامقدر ہے۔ بقول اقبال۔۔مومن وہ ہوتا ہے جسکی دعا پر اسکی تلوار آمین کہتی ہے۔اب جب کہ کشمیریوں نے یہ رویہ اپنا لیا ہے تو تقدیر اپنا فیصلہ صادر کرنے والی ہے ۔کشمیر کو بہرحال آزاد ہونا ہے اسلیئے پاکستان کو اس میں اپنا مثبت حصّہ ڈالنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے۔دنیا کو کیوں نہ بتایا جائے کہ یہ تحریکِ مزاحمت بھارت کے اپنے ظالمانہ رویّے کا ردِّعمل ہے اور یہ تحریک ایک کروڑ ۲۵ لاکھ عوام کے غصب شدہ حقِ خود اختیاری کی بازیابی کی سرفروشانہ تحریک ہے۔

احسان اکبر نے مجاہدین کی اس انقلابی جِدّوجُہد کا بھی متعدّد پہلوؤں سے مطالعہ کیاہے ۔حریّت پسندوں کے کارنامے گنوائے ہیں۔انکی مختلف تنظیموں'مجاہدوں اور اتحادوں کی تفصیل بیان کی ہے۔۔یہ جائزہ لیا ہے کہ مجاہدین کی گوریلا سرگرمیاں اسوقت کس سطح پر ہیں۔سکھوں کی تحریک خالصتان اس میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے۔بھارت اگر جنگ چھیڑدیتا ہے تواس کا ممکنہ محاذ کونسا ہوگا اور اس سے نمٹنے کے لیے کون سے موثر اقدامات ضروری ہیں۔اور۔۔اکیسویں صدی کی دہلیز پر اس مسئلے کو منصفانہ طور پر حل کرنے کے لئے کونسی تدابیر اور تجاویز کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔کتاب کا آخری حصّہ انہی تجاویز پر مشتمل ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلے کی صحیح صورت پیش کرکے

ضمیرِ عالم کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے سارے وسائل پوری توانائی کے ساتھ حرکت میں لائے جائیں بھارت کی عریاں جارحیّت کی پُرزور تشہیر کر کے بھارت کے اندر اپنے ہمنوا پیدا کئے جائیں" اقلیتّوں کے ساتھ بھارت کے غیر انسانی سلوک اور اسکی جملہ کثافت کاریوں کی روداد سے دنیا کو آگاہ کیا جائے' اقوامِ متحدہ کو اپنی قراردادوں پر عمل کرنے پر اُکسایا جائے' انسانی حقوق کے کمشن سے رجوع کیا جائے' عالم اسلام سے رابطے کئے جائیں۔اسلامی کانفرنس میں بھارت کے خلاف زور دار قرار دادیں پاس کی جائیں' دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ کوئی سرحدی تنازعہ نہیں ہے ایک بہت بڑی انسانی آبادی کے بنیادی حق کا مسئلہ ہے اور اس ضمن میں بھارت کی ہٹ دھرمی امنِ عالم کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے ۔ میں اس موقع پر 'جمّوں و کشمیر۔ ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ ' کے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا تاکہ احسان اکبر کے توانا قلم' جاندار تحریر اور موضوع پر اسکی گرفت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔"

"کشمیر برِّصغیر کے سر پر بندھا وہ دودھیا طُرّہ ہے جس کے پیچ کُھلنے پر بڑی بڑی قامتوں کی درازی کا بھرم کُھلتا ہے۔اس داستان کی تہہ میں واحد مرکزی گرہ دانشور نہرو کی حد سے بڑھی ہوئی وہ حُبِّ وطن ہے جو بے اصولی' دھاندلی' جھوٹ' فریب اور ڈھٹائی سے ہوتی ہوئی ظلم تک جا پہنچی۔"

"تقدیر کا یہ کیسا بھیانک مذاق ہے کہ جس خطّہ زمین پر فطرت نے بڑی فیّاضی کے ساتھ حسن کی دولت کو نچھاور کیا اسکے باسیوں کو غربت کے نہایت ہی عمیق گڑھے میں دھکیل دیا۔"

"ہندو استحصال کے خلاف جس جہاد نے پاکستان بنایا اسکی بدترین مثال کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے ظلم و ستم کی صورت میں موجود تھی۔"

"ایک نہرو خاندان نہ ہوتا تو مسٹر ریڈکلف پاکستان کے جغرافیے سے یوں نہ

کھیلتے۔۔کبھی ایک شیخ عبداللہ اپنے نجات دہندہ مسلم لشکر کے خلاف صف آرا نہ ہوتے!۔۔۔۔مگر اس تمنّائی جملے کے حریری پردے کے پیچھے دو نسوانی وجود جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور اندرا گاندھی۔۔۔اور بھارتی الحاقِ کشمیر کے سیاسی مظاہر کے پیچھے کون مانے گا کہ پنڈت نہرو اور شیخ عبداللہ کی حد سے بڑھی ہوئی اپنی اپنی ہوسیں کارفرما نہ تھیں جو ملک گیری اور محبت دونوں کے کام آتی رہیں۔"

"جموّں و کشمیر اور پاکستان دونوں کی داستانیں ایک سے کرداروں کے ہاتھوں متاثّر ہوتی رہی ہیں۔ عوامی احساسات پر بیوروکریٹک سیاست کا غلبہ ہماری پہلی پسپائی ہے"۔

"اس مسئلے کے بارے میں قایداعظم کے بعد کوئی رہنما SERIOUS نہیں رہا۔"

"ہماری سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ جو بات بھارتی وزیر اعظم اور جنتا پارٹی کہہ رہی ہے وہی ہماری وزیراعظم کے منہ سے بھی نکلتی ہے۔"۔۔۔۔"۲۰ بیس برس تک کسی پلیٹ فارم، کسی کانفرنس، کسی عالمی فورم سے ہم نے کشمیر کا نام نہیں لیا۔"

"آج پاکستان کی کشمیر پالیسی 'تیسی تے نُس کرسی' کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

" انسانی اخلاقیات سے لے کر اصولِ سیاست تک اصول و معیار کے کسی بھی مروّجہ نظام کے ناتے سے بھارت کشمیر اور جموّں پر اپنا دعویٰ ثابت کرنے سے قاصر ہے۔"

کشمیریوں کی جدوجہد کو پاک بھارت مذاکرات نے ہر عہد میں نقصان پہنچایا ہے۔"

"اگر ہم سندھ کی سرحدوں پر بھارت کی یلغار روک لیں تو مطمئن سندھ بھارت کو پیشقدمی سے روکنے والی چٹان بن سکتا ہے۔"

" مغربی لادینیت کے مقابل وسطِ ایشیا اور جنوبی ایشیا کی غیر عرب مسلم دنیا کا سلسلہ مغرب میں ترکی تک باہم متصّل علاقوں کی صورت میں ایک عظیم بلاک بن کر نمودار ہونے والا ہے۔"

اقتباسات کی یہ چند جھلکیاں اس کتاب کی ارزش و اہمیت کی پوری شہادت فراہم کرتی ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ تجاویز کے ضمن میں ترجیح طلب تجویز یہ ہے کہ اقوام عالم اور خاص طور پر مسلم ممالک کی طرف سے بھارت پر زیادہ سے زیادہ اقتصادی دباؤ ڈالا جائے اسلئے کہ نہیں کوئی بھگوان بنئے کا سوائے مایا کے۔

بھارت نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان کوامریکی امداد ملنے کے بہانے کشمیرمیں استصواب رائے نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا۔اب توخود بھارت کا امریکہ سے دفاعی معاہدہ ہو چکا ہے۔ اور صورتحال بالکل برعکس ہوگئی ہے۔بھارت سرکار سے اب کیوں نہ پوچھا جائے کہ اسکے نزدیک استصواب رائے کی قرارداد کی اب کیا حیثیت قرار پاتی ہے۔اب تو اس کے بہانے کی بنیاد بالکل کالعدم ہو کر رہ گئی ہے۔

احسان اکبر نے مسئلہ کشمیر پر یہ کتاب لکھ کر اپنے ملک کی ادیب اور شاعر برادری کی طرف سے ایک بہت بڑا حق ادا کیا ہے اور انکو اس مسئلے کے بارے میں اپنے فرض کی ادائیگی کی ترغیب دی ہے۔ویت نام اور کوریا پر نظموں کے ڈھیرلگانے والے آخر اس مسئلے کے بارے میں مصلحتوں کا شکار کیوں ہیں جو سراسرا انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔۔یہ مسئلہ اصولِ تقسیم سے خیانت کاری کا مسئلہ ہے۔انسانی محرومیوں کی ایک تلخ داستان ہے۔ برصغیر کے کروڑوں انسانوں کو خوداراديت کا حق ملا اور کشمیریوں کواس حق سے محروم کردیا گیا۔یہ مسئلہ کشمیری مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس کی الحاق پاکستان کی قرارداد کو فراموش کرنے کی قبیح سرگذشت ہے۔یہ مسئلہ ایک مسلم ریاست پر ہندو کے غاصبانہ قبضے کا مسئلہ ہے۔نہتّے جوانوں،معصوم بچّوں اوربوڑھوں کے قتل عام کا مسئلہ ہے۔ہزاروں عصمتوں کی پامالی کا مسئلہ ہے۔ہندوستان کے ٹوٹے ہوئے وعدوں کی کہانی ہے۔اپنے سچّے موقف سے رُوگردانی کا قصّہ ہے ۔کشمیریوں کی یہ تحریک،تحریکِ پاکستان کا تسلسل ہے اس لئے یہ مسئلہ دوقومی نظریئے کی تکمیل کا مسئلہ

ہے۔خود ہماری اپنی بقا کا مسئلہ ہے۔

احسان اکبر نے اپنی حکومتوں کی بے حسی کا کُھل کر تذکرہ کیا ہے۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ دور میں بھی اس مسئلے کے ضمن میں بین الاقوامی سطح پر ہماری کارکردگی ہمارے لئے خفّت اور اِہانت کا باعث ہوئی ہے۔اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی اور جنیوا میں انسانی حقوق کے کمشن کے اجلاس میں ہماری قراردادیں افسوسناک پیش وپس کا شکار ہو کر رہ گئیں۔اسلامی کانفرنس نے کاسابلانکا میں جو قرارداد منظور کی ہے۔ ایسی قراردادیں اسلامی کانفرنس کے گذشتہ اجلاسوں میں بھی منظور ہوتی رہی ہیں۔المیہ یہ ہے کہ جو ممالک اسلامی کانفرنس میں ہماری حمایت میں ہاتھ اٹھاتے ہیں اقوامِ متحدہ میں پہنچ کر ہماری حمایت سے ہاتھ اٹھالیتے ہیں ـــــ اس پر مستزاد یہ کہ انہی دنوں برطانیہ کے وزیرِ خارجہ ڈگلس ہرڈ نے پاکستان میں آکر اقوامِ متحدہ کی کشمیریوں کے حقِ خودارادیت سے متعلّق واضح قراردادوں کو فرسودہ قرار دیا ہے۔گویا انگریز نے کشمیر کو تیسری مرتبہ ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کرنیکی ٹھان رکھی ہے۔کشمیر کمیٹی کے سربراہ نواب زادہ نصر اللہ کا ایک حالیہ بیان بھی کیسی درد ناک تصویر پیش کر رہا ہے۔نواب زادہ صاحب فرماتے ہیں۔

"ہماری حکومتیں آخری کشمیری کے مرنے کا انتظار کررہی ہیں تاکہ یہ مسئلہ ہمارے سر سے ٹل جائے" اس تازہ ترین صورتحال پر بھی غور کیجئے تو احسان اکبر کا قلق بے جانہیں۔ خدا کرے کہ مجاہدین کشمیر کی تحریکِ حریّت کامیابی سے ہمکنار ہو اور کشمیر کے بارے میں حضرتِ اقبال اور پیروِفکرِ اقبال پروفیسر احسان اکبر کی آرزوئیں پوری ہوں۔ میں نے ایک عمر احسان اکبر کی رفاقت میں بسر کی ہے۔ میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں ۔قومی اور ملّی مسائل کے بارے میں اس کی دلسوزیوں اور آرزو مندیوں کا میں بے انتہا قدردان ہوں۔میں سمجھتا ہوں کہ حُبِّ دین و وطن، دل حسّاس

و درد مند، تجزیاتی اور منطقی ذہن اور زبان و بیان کی زیبائی ——— یہ چار عناصر ہوں تو پھر بنتا ہے احسان———اور 'جموں و کشمیر ——— ہمارا اکیسویں صدی میں داخلہ' کا ورق ورق اسکی شہادت فراہم کرتا ہے۔

احسان اکبر کی پیش کردہ تجاویز میں میں بھی اپنی ایک تجویز شامل کرنا چاہتا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ اقوامِ متحدّہ کے پلیٹ فارم کی ساری زبانوں میں کر کے دنیا بھر میں اسکی اشاعت کی جائے۔

جلیل عالی کا خواب دریچہ

میرے ایک استاد تھے۔سید وزیر الحسن عابدی ـــ ایم ۔اے کے زمانے میں مجھے ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ان کے بارے میں بے طرف اور بے تعصّب پڑھے لکھے لوگوں کی رائے یہ تھی کہ ایسا شعر فہم اور زبان شناس صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔عابدی مرحوم اپنے شاگردوں سے پہلی ملاقات ہی میں کہہ دیا کرتے تھے کہ جس کے پاس کوئی سوال نہیں وہ میری کلاس میں نہ آئے اس لئے کہ علم سوال سے پیدا ہوتا ہے اور سوال تجسّس سے پھوٹتا ہے۔

علاّمہ اقبال نے بھی ایک جلالی پیرائے میں ایک ایسی ہی بات کہی ہے کہ ـــ نظر نہیں تو مرے حلقہ سخن میں نہ بیٹھ ـــ یہ نظر بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ سوال پیدا

کرنے والا تجسّس بڑا جاں گداز ہے ۔ جلیل عالی کی غزل کا دریچہ بھی اسی پروا ہوتا ہے جسکے پاس یہ متاعِ تجسّس موجود ہے وہ بھی اپنے قاری سے یہی کہتا ہے۔

جاں پر قیامتیں سی گذرنے تو دیجئے
دل میں کوئی سوال اُبھرنے تو دیجئے

عالی کا محکم عقیدہ ہے کہ جو دل نزول سوالوں سے محروم ہو اسکی شاخ پر خیال کی کوئی شاداب کونپل نہیں پھوٹ سکتی۔عالی سے میری برسوں کی شناسائی ہے۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا ہے کسی نہ کسی مسئلے کی گرہیں کھولتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی نہ کسی علامتِ استفہام کی گرفت میں دیکھا ہے۔ کسی نہ کسی سوچ میں گُم پایا ہے۔اسکے بارے میں اگر میں یہ کہوں تو اسمیں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ پیکر میں ڈھلی ہوئی سوچ اور سوچوں میں ڈھلا ہوا ایک پیکر ہے اور

برین دعویٰ کہ کروم شاہدے ہست

جو دعویٰ میں نے کیا ہے میرے پاس اسکی گواہی موجود ہے۔سوچ ہی وہ لفظ ہے جو نئے نئے تجربوں سے ترکیب پا کر عالی کی غزل میں سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اسکے ہاں یہ لفظ زیادہ تر بے چینی اور اضطراب کے ساتھ گُندھا ہوا ہے۔

سوچیں جواں ہوئیں تو عقیدے تڑخ گئے
دریا چڑھے تو کتنے بھنور جاگنے لگے

پھر سوچ کے ساحل پر موجوں نے یہ ٹھانی ہے
کچھ نقش مٹانے ہیں اک شکل بنانی ہے

ہوا جو سوچ کی اکھڑی تو پھر سنبھل نہ سکا
میں دو قدم بھی کہیں اپنے ساتھ چل نہ سکا

اپنی سوچوں کا کہیں کوئی نشان ملتا نہیں
دوسروں کی کتنی باتیں ہو گئیں ازبر مجھے

اک سحرِ ضیا میں ہیں سبھی کون یہ سوچے
ٹوٹا ہے جو تارا وہ کہاں جا کے گرا ہے

میں نے عالی کو انفرادی، اجتماعی، تہذیبی، تحریکی اور سیاسی رویّوں کی گمراہیوں پر بڑی بیتابیوں میں گھرا دیکھا ہے ۔ عالی کی سوچوں کے دائرے ذات اور کائنات کے سارے زندہ رابطوں تک پھیلے ہوئے ہیں-جہاں کہیں کسی رابطے کو کوئی ٹھیس پہنچتی ہے تو عالی کے لئے وہ ایک مستقل آزار کی صورت اختیار کر جاتی ہے-اسکی ناآسودگیوں کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ظالم لمحوں کی یلغار نے اسکی توقّعات کو زخمی کر دیا ہے-عالی سراپا سوال ہے کہ لوگ اک دوسرے کو کیوں روندتے چلے جارہے ہیں-پرندے اجنبی دیسوں کو ہجرت کرنے پر کیوں مجبور ہیں؟اپنی تنگ تابیوں کو نمایاں کرنے کے لیے بستیوں کے چراغ کیوں بجھائے جارہے ہیں؟ ایسا کیوں ہے کہ لوٹنے والے آواز بھی لوٹ کر لے جاتے ہیں-عالی کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ دامانِ زیست کیوں تار تار ہے؟

ارض وطن عالی کی آرزوؤں کا محور ہے- یہ سر زمین اپنی منزل کی تلاش میں ہے--یہ منزل جب قریب آنے لگتی ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جھوٹی اناؤں کا ایک گھنا جنگل اس کا راستہ روک لیتا ہے-

بلایا کئی آشنا موسموں نے ملن ساحلوں پر
نہ دیوار بنتیں اگر کچھ انائیں تو ہم کب ٹھہرتے

کچھ دُور نظر آئے جو خوابوں کے جزیرے
ہم ڈوب گئے اپنی اناؤں کے بھنور میں

کھڑی ہیں درمیاں کتنی انائیں
یہ جنگل راہ سے کیسے ہٹائیں

جب بھی ایسا جنگل راستے میں آن کھڑا ہوتا ہے تو عالی کی حساس روح پر کئی واہمے رینگنے لگتے ہیں۔وہ اس سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ آرزو کے شجر پر دکھوں کے کڑوے کسیلے پھل کیوں نمودار ہوگئے ہیں؟عین اختتام سے پہلے بساط کیوں الٹ جاتی ہے۔ عالی کے نزدیک یہ روّیہ کس طرح بھی مناسب نہیں کہ اختلافِ نظر کو وطن دشمنی کا جواز بنا لیا جائے۔

شہر میں سو ترمیم ضروری ہو
شہر پناہ پہ ضرب لگانا ٹھیک نہیں

اور جب یہ بھیانک ضرب لگا کر پاکستان کو دولخت کر دیا گیا تو اس دن عالی کا یہ حال تھا کہ وہ میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا تھا۔اس جانکاہ صدمے کو اس نے ایسی شدت سے محسوس کیا کہ وہ ایسا شعر کہنے پر مجبور ہو گیا۔

اس دن ایسی سرخی تھی اخباروں پر
گونگے ہوگئے شہر کے سارے ہاکر بھی

عالی کے نزدیک ان لوگوں کا رویہ انتہائی افسوسناک ہے جو مصلحتوں کا شکار ہو کر اپنے آپ سے بھی منحرف ہوجاتے ہیں اور انکی اناؤں کے سورج بجھ کر دُھواں دُھواں ہوجاتے ہیں۔

ان اضطراب انگیز سوچوں کے ساتھ ساتھ عالی کی سوچ کی رفعتوں کا بھی ایک منظر ہے۔وہ منظر لمحہِ موجود کے مناظر سے بہت ارفع اور بہت زیبا ہے۔

بس رہا تھا مری سوچ کے آسمانوں پہ جو
اور ہی شہر تھا اسکے سب بام و در اور تھے

یہی شہر اسکا آئیڈیل ہے۔یہی اسکا جہانِ آرزو ہے۔عالی کی غزل میں شوق اور خواب کے لفظ اسی سے مربوط ہیں۔اسی شہر کی روشنیاں اور رنگ عالی کی منزل ہیں۔یہی اس کا شوق ستارہ ہے۔ یہی اس کی شوق تتلی ہے اور یہی اس کا خواب دریچہ ہے۔اسی خواب کی تعبیر سے اس نے اپنا پیمانِ وفا باندھ رکھا ہے۔ بد ہیئتی اور بے منظری کے دکھ سہتی ہوئی اسکی نگاہیں اسی کشور آرزو کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔

کبھی تو شہر تمنّا غبارِ غم سے نکل
نظر میں گھومتے رہتے ہیں بام و در سے ترے

عالی ایک صاحبِ یقین ہے۔اس کا یقین آندھیوں میں جلتاہوا چراغ ہے۔ اسے یہ ایقان حاصل ہے کہ وقت کے صحرا میں اس کا نخلستان تمنّا ضرور موجود ہے جو خود اسکے انتظار میں ہے۔

کھل اٹھیں گے بام و در پہ منتظر چہروں کے پھول
موسموں کی دُھند سے اُبھرے گا یوں پیکر مرا

یہ بات انتہائی قابل ذکر ہے کہ عالی کا شوق خانوں میں بٹا ہوا نہیں ہے کہ یہ غمِ جاناں ہے اور یہ غمِ دوراں۔اس کے ہاں ایسا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

فروزاں تھے لہو میں درد کے مہتاب کتنے
سب اسکے عکس تھے کس سے کسے ممتاز کرتے

وطن کی اساس سے' سماجی انصاف سے' پوری انسانیت اور خود اپنے ضمیر سے عالی کی

وفاؤں کے جو رابطے ہیں عالی کے دل میں ان سب کے لئے برابر کی کشش ہے۔ محبّتوں کی اس ہم آہنگی کی تلاش کو اس نے شوق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ان چاہتوں کی آغوش میں پروان چڑھتا ہوا ایک مثالی معاشرہ اس کا آس نگر ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں نقطۂ اعتدال کی تلاش اس کا ہدف ہے۔اپنے اس آئیڈیل کو وہ زمانے بھر کا آدرش بنانے کی سیمابی تمنّا لئے ہوئے ہے۔

دُھن ہے کہ زمانے کی نگاہوں میں بسا دیں
تصویر لئے پھرتے ہیں اک اپنی نظر میں

شوق کی یہ ہمہ جہتی ،ہمہ گیری اور ہم آہنگی عالی کے ہاں ایک وحدت کی ترجمان ہے۔اس مقام پر وہ کسی ذاتی انا کا قائل نہیں ہے ۔وہ اپنی ذاتی انا کی روشنی بھی اس انجمنِ آرزو کی تابندگی پر نثار کئے ہوئے ہے ۔

چاہتوں کی اس وحدت کے ساتھ ساتھ عالی کی غزل میں ایک ماورائی تجسّس کے کئی پُراَسرار مناظر دکھائی دیتے ہیں۔حسرتوں کا ایک سماں ہے۔خیال جسے چھُو نہیں سکتا اسے دیکھنے کی طلب ہے۔سوچ سے پہلے کے مرحلوں کے انکشاف کی آرزو ہے۔ لفظوں سے آگے رسائی پانے کی تڑپ ہے۔ اس مقام تک پہنچے کی لگن ہے جہاں گفتگو آواز کی رہینِ منت نہیں ہے۔اظہار میں جو فاصلہ رہ جاتاہے اسے طے کرنے کا ولولہ ہے۔ ساعتوں میں کسی اسم کے جی اٹھنے کی خواہش ہے۔ دل میں ایک نخلِ سعادت ہے۔ ایک شوقِ سفرہے جسکے ساتھ دعاؤں کا زادِ سفر ہے۔ نفرت سے بیزاری ہے۔ توفیقِ توبہ کی تمنّا ہے۔حرفِ تقدیر کو سمجھنے کی تڑپ ہے۔ان ساری باتوں میں تصوّف اور فلسفے کے امتزاج سے اُبھرنے والی ہماری عارفانہ روایت کا ایک جدید پرتو دکھائی دیتا ہے۔اس حوالے سے مربوط کائناتی سوچ سے ابھرنے والا عالی کا ایک شعر ملا حظہ فرمایئے

معیّن ہے یہاں سب کی حدِ پرواز جیسے
مسلسل پھینکتا جاتا ہے آگے تیر کوئی

اظہار کا یہ پیرایہ بڑی تازگی کا حامل ہے۔ فارسی کے حوالے سے میں نے اس شعر سے دگنا حظ اٹھایا ہے اس لئے کہ جدید فارسی میں مسلسل کا لفظ مشین گن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اور اب تیر کے لفظ کو گولی کے معنی دے دیئے گئے ہیں۔

عالی کی غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اسکی غزل زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ موتیوں کی مالا ہے۔اسلئے کہ وہ غزل میں اپنی داخلی کیفیت کا پابند ہے۔ قافیہ پیمائی اس کا مقصود نہیں ہے۔ اسکے ہاں کیّت کیفیت کے زیرِ اثر ہے اور ہنرِ غزل گوئی اسی چیز کا متقاضی ہے۔

صنفِ غزل چونکہ ایمائیت کی مظہر ہے اسلئے اس میں اختصار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس اعتبار سے عالی کی غزل خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے۔ایک روز سیّد ضمیر جعفری صاحب فارسی اور اردو زبان کا موازنہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اُردو میں تو مصرعہ 'کا' 'کے' 'کی' میں ہی ختم ہوجاتا ہے جبکہ فارسی میں ترکیب سازی کی ایسی سہولت میسّر ہے کہ اختصار بھی برقرار رہتا ہے اور مصرع کا حسن بھی۔عالی نے اضافتوں کی بھرتی میں مصرع کو دفن نہیں ہونے دیا بلکہ ترکیب سازی کا نہایت ہی اختصار آمیز اور دلآویز پیرایہ اختیار کیا ہے۔

عالی نے ترکیب سازی میں ترکیب کی اس صورت کو زیادہ پسند کیا ہے جس میں مضاف اور مضاف الیہ کی ترتیب الٹ دی جاتی ہے اور جسے اصطلاح میں اضافت مقلوب کہا جاتا ہے جیسے بچّہ مرغ سے مرغچہ 'آبِ گُل سے گلاب اور بہارِ دل سے دل بہار۔ اسکے مجموعے کا نام 'خواب دریچہ' بھی اضافیت مقلوب ہی کا ایک نمونہ ہے۔ اسی طرح 'خواب دریچہ' ہے۔ شوق ستارہ 'یاد زمین' دردثمر اور وفا سفر وغیرہ اضافت

مقلوب کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

ترکیب کی اس صورت میں عالی نے اردو کے قاعدے کے مطابق مضاف کی جمع بندی کرکے ڈھیر ساری ترکیبیں وضع کی ہیں۔ مثال کے طور پر شوق طغیانیوں، سراب دریچوں، دل تھوں، نشاط لمحوں، گمان شیشوں، فراق لمحے اور شوق مستیاں کی تراکیب استعمال کی ہیں۔اس دور میں اس اندازِ ترکیب کو عالی نے باقاعدہ طور پر اپنایا ہے اور اسے اپنے احساسات کی تجسیم کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس بناوٹ کے مرکّب تشبیہاتی مفہوم بھی بڑی خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر چاند صحبتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ترکیب یونہی پیدا نہیں ہوجاتی ہے۔ کوئی اچھوتا تجربہ اور کوئی نادر خیال ہوتا ہے جوایک نئی ترکیب کے پیکر میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

روایت کے اعتبار سے عربی اور فارسی الفاظ کے باہم ترکیب پانے کا جواز موجود ہے جبکہ ہندی اور فارسی الفاظ کی تراکیب مروّج نہیں ہیں۔شاید اسلئے کہ فارسی قاعدے کے مطابق ایسی ترکیب بڑی گوش خراش محسوس ہوتی ہے۔مثال کے طور پر اگر تتلیِ شوق کہا جائے تو کیسی مضحکہ خیز صورت پیدا ہوتی ہے لیکن اگر شوق تتلی کہہ دیا جائے تو اس ترکیب کی ساری کثافت دُھل جاتی ہے۔ سوچ وادی، سوچ انائیں آس نگاہوں اور سوچ جزیرے اسی اسلوُبِ ترکیب کی صورتیں ہیں ۔میں سمجھتا ہوں کی عالی کے ہاں یہ لسانی تجربہ بالکل نیا ہے اور اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ غزل کے نئے امکانات کی نشاندہی کرتا ہے ۔ شوق سمندر، شوق نگر اور ملن سال کی تراکیب فارسی اور ہندی صوتیات کو ہم آہنگ کرنے کا نادر اسلوُب ہے۔ یہ اندازِ ترکیب غزل کے اختصار سے بھی ہم آہنگ ہے اور ذوقِ سلیم بھی اسے قبول کرتا ہے

اسی طرح عالی کی غزل میں بعض پوری ہندی ترکیبیں مثلاً سوچ بھنور، سوچ نگر، کرن سندلیہ اور بھید پٹاری بھی بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

اسکے علاوہ عالی نے اسما کی جمع کو اس ہنر سے استعمال کیا ہے جس سے ایک ایسا اختصار پیدا ہوا ہے کہ حروفِ جار بے ضرورت ہوگئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:۔

اُسے سب موسموں ملنے کے کتنے راستے تھے
مگر دن کی رُتیں اپنی تھیں اپنے فیصلے تھے

سدا دُھوپوں جلے لیکن نہ عاؔلی
اماں مانگی کسی کے سائباں سے

کون خوشبوؤں مہکتی ہے مرے آنگن کی بیل
جگمگانے کو ہے کیسی روشنی سے گھر مرا

بوجھے کون سراب دریچوں چاند پہیلی
کریں یہاں سب اپنا اپنا نام تماشہ

عالی زبان کو بت نہیں سمجھتا۔ اسے ترسیلِ معانی کا وسیلہ خیال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ الفاظ کی ایسی تراش خراش کا قائل ہے جو زبان میں سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ اس نے بعض فارسی مصادر اور الفاظ کو اُردو مصادر میں ڈھال لیا ہے۔ اگر فارسی والوں نے عربی کے الفاظ فہم اور طلب سے فہمیدن اور طلبیدن بنا لیے ہیں تو پھر شمارنا' شکارنا اور تویرنا بنالینے کا بھی پورا جواز موجود ہے۔ اس ضمن میں تلاشنا اور تراشنا کے افعال پہلے ہی رائج ہو چکے ہیں۔

عالی نے غزل میں ترکیب سازی' الفاظ کی کفایت شعاری اور مصدر سازی کے جو تجربات کئے ہیں وہ خاصے سنبھلے ہوئے ہیں اور زیادہ تر حدِاعتدال میں ہیں۔ یہ بات اسکے پیشِ نظر رہی ہے کہ ان تجربوں سے شعر کا صوتی حسن برقرار رہے۔ اگر اس

کوشش میں توازن کو مدِّ نظر نہ رکھا جاتا تو ناخوشگوار تاثّرات کے پیدا ہونے کا امکان بھی موجود تھا۔

عالی کی غزلوں کی بحریں مُتداوِل بحروں کے مختلف ہیں۔بحر کا انتخاب دراصل کسی انسان کی اندر کی موسیقی سے اُبھرتا ہے اور اسکی انفرادیت کا حامل ہے۔ عالی کی خوئے تفکّر اسکی غزل کی بحروں کی فضا پر چھائی ہوئی ہے۔ جوں جوں اسکی فکر سے آشنائی پیدا ہوتی ہے اسکی بحریں مانوس محسوس ہونے لگتی ہیں۔

عالی کی غزل اسلوب اظہار ،طرز احساس اور اپنی صوت و صدا کے اعتبار سے ایک منفردِ آواز ہے جو الگ پہچانی جاتی ہے۔وہ ایک نیا اندازِ تغزّل لیکر آیا ہے۔جس میں نرمی بھی ہے اور دلگرمی بھی۔اسکی غزل تیز بارشوں جیسی نہیں جو محض ایک لمحاتی جل تھل پیدا کردیتی ہیں بلکہ تہوں میں اتر جانے والی رِم جھم کی طرح ہے۔

عالی حضرت علاّمہ اقبال کو اپنا فکری اور فنی رہنما سمجھتا ہے۔ اس نے اقبال کی پیروی میں اپنے عہد کے مسائل کو نظریاتی سوچوں کے تناظر میں غزل کے ایک جدید پیرائے میں بیان کیا ہے۔یہ مماثمت ایک وسیع تر تناظر کی مماثلت ہے ورنہ جلیل عالی کا شعری مزاج اور اُسلوب اظہار بالکل اپناہے۔ اس نے ایک غزل میں اقبال کے حوالے سے ایک دعائیہ شعر لکھا ہے۔

یارب ہنرِ شعر میں اقبالؔ کے صدقے
رکھنا مرے لکھے ہوئے الفاظ کی شرمیں

اقبال اس لئے بھی عظیم ہے کہ اسکے مقاصد اور محبتّیں بھی عظیم ہیں۔عالی نے اپنے سفرِ وفا میں اقبال کی طرح اسی ذات یکتا کی چاہت کو اپنا رہنما قرار دیا ہے جو سب جہانوں کی انتہا ہے اور اسکے تجسّس کی منزل کا آخری نشان ۔جنابِ رسالتماب علیہ الصلواۃ والتسلیمات کی ہستی والا صفات ہے ۔

عالی نے انکسار کے لہجے میں اپنی اس کاوش کو ابجد کا نام دیا ہے۔ حالانکہ شہرِ تحریر میں وہ بڑے معتبر لفظ لے کر آیا ہے۔میں اسکی دعا پر تہ دل سے آمین کہتا ہوں۔

کِھلیں وفا کے کنول حرف حرف لہروں پر
ملے دلوں کو نمو چشمہِ ہنر سے مرے

بشیر سیفی کی 'خاکہ نگاری' پر ایک نظر

ڈاکٹر بشیر سیفی علمی اور ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ شاعری' تحقیق اور تنقید تینوں شعبوں میں ان کا کام قابلِ اعتنا ہی نہیں شائستہِ تحسین بھی ہے۔ 'مطلع' ان کا اوّلین مجموعہِ شعر ہے جو ایسی غزلیات پر مشتمل ہے جن میں بڑی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ 'گفتار' ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ اس میں منظومات بھی شامل ہیں اور ہائیکو بھی۔ اردو میں انشائیہ نگاری ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے جو ان کے تحقیقی ذوق اور تنقیدی بصیرت کی بھرپور آئینہ داری کرتا ہے۔ ہائیکو' انشائیہ اور خاکہ نگاری کے بارے میں بالخصوص انہوں نے ایسے اعلیٰ نقد و نظر اور ذوقِ سلیم کا مظاہرہ کیاہے جس کے پیشِ نظر انہیں ان موضوعات کا متخصّص قرار دیا

جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔

ڈاکٹر بشیر سیفی کی شخصیت کو ہم ریاضت اور ذہانت کے امتزاج کی ایک نادر مثال کہہ سکتے ہیں۔ ان کی کنج کاوی اور فہم و فراست کی تازہ مثال ان کی کتاب 'خاکہ نگاری۔فن و تنقید' ہے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں اور کچھ اضافوں کے ساتھ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔

خاکہ نگاری کے موضوع پر پاکستان میں چھپنے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فنِ خاکہ نگاری کی مبادیات' آزادی سے قبل اُردو میں خاکہ نگاری اور پاکستان میں خاکہ نگاری کے عمومی جائزے کو بڑی کامیابی کے ساتھ ۱۲۰ صفحات کی ضخامت میں سمیٹ لیا ہے۔ یہ جائزہ ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والے خاکوں کے مجموعوں پر محیط ہے۔ جن مجموعوں کا جائزہ لیا گیا ہے کتاب کے آخری حصّہ میں ان کی فہرستِ مضامین بھی بطور ضمیمہ درج کر دی گئی ہے۔

ابتدائی چند صفحات میں ڈاکٹر سیفی نے بڑے جامع اختصار کے ساتھ خاکہ نگاری کے بنیادی خط وخال کا تعین کیا ہے تاکہ سوانح' شخصیت نگاری' تعارفی' توصیفی' تاثراتی اور تنقیدی مضامین سے اس صنف کا امتیاز واضح کیا جاسکے۔ یہی ابتدائیہ وہ اساس فراہم کرتا ہے جس پر پُوری کتاب کی عمارت کھڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخصیت کی انفرادیت کو کمالِ اجمال کے ساتھ بیان کر دینے کا نام خاکہ نگاری ہے۔ یہ صنف پھیلاؤ کی متحمّل نہیں بلکہ حسنِ انتخاب کا معاملہ ہے۔ خاکہ نگار وہ ہے جو کسی شخصیت کے تعارف میں غیرضروری تفصیل کو ترک کرنے کا ہنر جانتا ہو اور حسنِ اعتدال کے ساتھ کسی کے ظاہری اور باطنی عیب و ہنر کی جھلکیاں اس طرح دکھائے کہ شخصیت کی دلآویزی مجروح نہ ہونے پائے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی تائید میں ڈاکٹر بشیر سیفی کا موقف یہی ہے کہ خاکہ پورٹریٹ

نہیں بلکہ پنسل سکیچ ہے۔ بشیر سیفی لکھتے ہیں۔

"سکیچ مصوّری کی اصطلاح ہے جس میں چند لکیروں کی مدد سے کسی شخص کے چہرے کے خدوخال واضح کئے جاتے ہیں لہٰذا ادب کی اس صِنف میں الفاظ کی وہی اہمیت ہے جو مصوّری میں لکیروں کی ہے۔ بنابریں اختصار خاکہ کی بنیادی خوبی قرار پاتی ہے۔ خاکہ نگار کو کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف اجاگر کرنا ہوتے ہیں۔ یہ کام ایک خاص سلیقے اوردقّتِ نظر کا طالب ہے کیونکہ خاکہ نگار کے پاس واقعات اور تاثرات کا انبار ہوتا ہے اور اسے اُن میں سے ایسے واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جن کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نظر آئے۔ غیرِضروری تفصیلات اور واقعات کی بھرمار سے خاکہ کا تاثّر مجروح ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۰)

خاکہ نگاری کے بارے میں مختلف ناقدین کی آراء کا محاکمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے درجِ ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے :

"مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاکہ ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں فرد کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہو"۔ (صفحہ ۱۷)

اقتباساتِ بالا خاکہ نگاری کی حدود کے تعیّن میں ڈاکٹر بشیر سیفی کے موقف کی مکمل وضاحت کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس نپے تلے موقف سے اختلاف کی گنجائش بہت مدّھم ہے۔ یہی وہ موقف ہے جس کی روشنی میں انہوں نے آزادی سے قبل اُردو خاکہ نگاری اور پاکستان میں خاکہ نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اس

مواد کی فراہمی اور جمع آوری میں ڈاکٹر صاحب نے جس محنت اور لگن کا ثبوت دیا ہے اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس کا تنقیدی جائزہ اس کتاب کا اہم ترین اور وقیع ترین حصّہ ہے۔ اس کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس طرح مکمّل صحت مند انسان خال خال ہوتے ہیں اسی طرح اُردو میں تاحال ایسے مضامین بہت کمیاب ہیں جن پر کامیاب خاکہ کا اطلاق ہو سکے۔ شاید یہ شعر ڈاکٹر صاحب کے موقف کی کچھ ترجمانی کر سکے۔

تفصیلِ ناروا سے مبرّا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ خاکہ کہیں جسے

ڈاکٹر صاحب نے فرحت بیگ کی 'نذیر احمد کی کہانی' سے لے کر عصمت چغتائی کے 'دوزخی' تک اور رئیس احمد جعفری کی 'دیدوشنید' سے لے کر لطیف کاشمیری کے "جمالِ ہم نشیں" تک تقریباً پچاس کتابوں کا جائزہ لیا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے۔

"خاکہ نگاری کے مجموعوں کے اس تنقیدی جائزے سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ اُردو میں اس صنف کے واضح تصوّر کے تحت بہت کم خاکے لکھے گئے ہیں اور بالعموم شخصیات پر لکھے گئے ہر قسم کے مضمون کو خاکے سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔" (صفحہ۹۸)

ڈاکٹر بشیر سیفی کی خوبی یہ ہے کہ اس تنقیدی جائزے میں انہوں نے انصاف کے ترازو کو بہت مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ خاکے کا جو کڑا معیار مقرر کیا ہے اس پر کسی خاکے کو پرکھتے ہوئے وہ کسی تذبذب یا جھجک کا شکار نہیں ہوئے۔ مختلف خاکوں میں جو رطب و یابس اور حشو و زواید انہیں دکھائی دیا ہے اس کی کھُل کر نشاندہی کی ہے۔ فرحت اللہ بیگ ہوں یا رشید احمد صدّیقی، منٹو ہوں یا عصمت چغتائی، عبدالمجید

سالک ہوں یا مولوی عبدالحق کوئی بڑے سے بڑا ادبی نام بھی انہیں مرعوب نہیں کر سکا۔ عصمت کے 'دوزخی' کی بڑی دھوم ہے۔اس کے بارے میں ڈاکٹر بشیر احمد سیفی کی رائے سنئے۔

"مجھے یہ خاکہ پڑھنے کا بہت اشتیاق تھا مگر خاکہ پڑھنے کے بعد مجھے اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جس کے سبب اسے اُردو کا بہترین خاکہ کہا جا سکے۔ 'دوزخی' کو بہترین خاکہ قرار دینا غالباً تقلید پسندی کا نتیجہ ہے۔ یقیناً دوزخی اپنی نوعیت کا منفرد خاکہ ہے بالخصوص اس لیے کہ ایک بہن نے اپنے بھائی کو دوزخی کہا ہے جو مشرقی روایات کے خلاف ہے۔ مگر محض اس لیے اسے بہترین خاکہ نہیں کہا جا سکتا کہ بہن نے بھائی کو بُرا بھلا کہا ہے۔ فنی طور پر اسے بہترین خاکہ کہنے میں اس لیے بھی تامل ہے کہ اس میں صرف برائیاں ہی برائیاں ہیں اور وہ بھی اتنے مبالغے کے ساتھ کہ مضحکہ خیز ہو کر حقیقت سے دور معلوم ہونے لگتی ہیں"۔ (صفحہ ۴۱)

منٹو کے خاکوں کے مجموعے 'لاؤڈ سپیکر' کے بارے میں ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں:

" لاؤڈ سپیکر کے خاکوں کے مطالعے سے وہی منٹو سامنے آتا ہے جس نے متعدد قابلِ اعتراض افسانے تخلیق کر کے بدنامی حاصل کی تھی۔ ان خاکوں کو پڑھنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ منٹو کی نظر اچھائیوں کے بجائے برائیاں تلاش کرنے کی عادی رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ برائیوں کو حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ شخصی خاکوں میں تصویر کے دونوں

رُخ پیش کرنا ہوتے ہیں مگر خامیوں کے بیان میں جس اعتدال
اور توازن کی ضرورت ہوتی ہے 'لاؤڈ سپیکر' کے خاکوں میں اس
کی شدید کمی نظر آتی ہے۔ ان خاکوں میں کمزوریوں کا بیان اتنے
کھُردرے اور اونچے لہجے میں کیا گیا ہے کہ وہ ساری شخصیت پر
حاوی نظر آنے لگتی ہیں۔ تخلیق کار کا منصب پھُولوں کے انبار
میں صرف گندگی تلاش کرنا ہی نہیں بلکہ کوڑے کے ڈھیر سے
پھُول چُننا بھی ہے جبکہ منٹو نے اس کتاب میں صرف گندگی
اُچھالی ہے۔ وہ ہمدردانہ لہجہ جو خاکہ نگار کو خاکے کی شخصیت سے
ہونا چاہیے منٹو کے ان خاکوں میں مفقود ہے۔" (صفحہ ۴۷)

ڈاکٹر بشیر سیفی کے تجزیے کے مطابق خاکہ نگاری کے کچھ سُتھرے نمونے محمد طفیل، رشید احمد صدّیقی، ضمیر جعفری اور ممتاز مفتی کے یہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے ان حضرات کے بعض خاکوں کی خوبیوں کو بڑی تحسین کا مستحق قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اختلاف کے جو پہلو نکل آئے ہیں ان کا بھی برملا اظہار کر دیا ہے۔

ضمیر جعفری کے مجموعے 'کتابی چہرے' پر ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ ملاحظہ کیجئے:

"'کتابی چہرے' ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً اہل قلم
کی کتابوں کی رونمائی کے مواقع پر پڑھے گئے ہیں۔ اس لیے کسی
مضمون میں چہرہ زیادہ ہے کسی میں کتاب — ضمیر جعفری اپنے
ممدوحین کی خامیوں سے عموماً صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ
ہے کہ ان کے خاکوں میں محبّت، عقیدت اور احترام کا جذبہ خاصا
نمایاں ہے۔"

"اس کے باوجود چراغ حسن حسرت کا خاکہ 'سنگاپور کا میجر

حسرت' اور عزیز ملک کا خاکہ 'ادب کا حجرہ شاہ مقیم' ایسے
خاکے ہیں جنہیں ادبی طور پر مکمّل کہا جاسکتا ہے۔ ان خاکوں میں
سرورِ رفیقانہ کی رَو بھی ہے اور حسرت و عزیز کی بشری خامیوں کی
طرف فنکارانہ اشارے بھی موجود ہیں۔ حسرت کے خاکے میں تو
سیرت نگاری' واقعہ نگاری اور بیانیہ کا حسن عروج پر ہے۔ میری
رائے میں یہ خاکہ نہ صرف 'کتابی چہرے' کا بہترین خاکہ ہے
بلکہ فنی خوبیوں اور گوناگوں محاسن کے سبب سے اُردو کے بہترین
خاکوں میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔" (صفحہ ۸۱۔۸۰)

ڈاکٹر بشیر سیفی کو کسی تحریر کے باطن میں جھانکنے اور اس کی بنیادی خصوصیت کا کھوج لگانے کا بے پناہ ملکہ تفویض ہُوا ہے۔ یہ تحریر شناسی ان کا وصفِ خاص ہے۔ ممتاز مفتی کے اندازِ تحریر پر اس سے زیادہ جامع' مختصر اور قرینِ صحّت تبصرہ اور کیا ہو سکتا ہے:

"ان کے اُسلوب میں ایک خاص قسم کی دلکشی ہے جو قاری کو
اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر پڑھتے
ہُوئے خاص قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔"

مفتی صاحب کی خاکہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے دیکھئے:

"ممتاز مفتی کی خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ ہے کہ وہ خاکہ لکھتے
ہوئے ظاہری شخصیت ہی کو مدِنظر نہیں رکھتے بلکہ شخصیت کے
بطون میں اُتر کر اس کے افکار و کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی
بھی کوشش کرتے ہیں۔"

اس کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر بشیر سیفی نے اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ بھی مرتب کی

ہے' اس کی فنی حدود کا تعیّن بھی کیا ہے' خاکہ نگاری کے مجموعوں کا بے لاگ تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے اور مستقبل کے خاکہ نگاروں اور اس فن کے ناقدین کے لیے نہایت مفید اور بنیادی مواد بھی فراہم کر دیا ہے۔

منّتے بر قدم راہروان است مرا

ڈاکٹر بشیر سیفی کے اُسلوب میں ایسی Readability ہے جو بالعموم تنقیدی تحریروں میں مفقود ہوتی ہے۔ ان کی تحریر کہیں مبہم اور گنجلک محسوس نہیں ہوتی۔ انہوں نے بڑے بیّن انداز میں خاکے' نیم خاکے اور ناخاکے کے فرق کو واضح کر دیا ہے۔ تحریر کا منطقی ربط اور موضوع کی پابندی خاص طور پر متاثر کرتی ہے۔ اقتباسات کے حسنِ انتخاب نے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کا اُسلوبِ بیان خستگی آور نہیں بلکہ خستگی رُبا ہے۔ ان خصوصیات کی بنیاد پر ایک ادیب ہی نہیں بلکہ ادب کا ایک عام قاری بھی بھرپور دلچسپی کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

مَیں نے پہلی دفعہ ایک ایسی کتاب دیکھی ہے جس میں کتابت کی کوئی ایک غلطی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ایسا لگتا ہے اس کی پروف ریڈنگ میں ڈاکٹر بشیر سیفی نے وہی احتیاط برتی ہے جو تنقید و تحقیق میں ان کا خاصہ ہے۔

پھُلواری

اُستاد کرمؔ کے مجموعہ کلام "پھلواری" میں سب سے زیادہ نمایاں چیز یہ دکھائی دیتی ہے کہ اُستاد کا حسین تخیّل ہمیشہ اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے۔ مرکز گریز رجحانات ان کے یہاں نا پید ہیں۔ اس مرکز کی دریافت انکی شاعری کے مجموعی تاثّر سے ہوتی ہے۔ پھلواری کے بیشتر پھول ایک ہی نو بہار کے پروردہ ہیں۔اور یہ نو بہار دین اسلام کی حقانیت اور افادیت پر اُستاد کا محکم ایمان ہے۔ اُستاد کے بارے میں کھینچ تان کر لکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے کہ یہی ان کے کلام کا محور ہے۔ استاد کے مذہبی تصوّارت کا تذکرہ دراصل ان کے کلام کی روح کا تذکرہ ہے۔ علاّمہ محمّد حسین عرشی نے پھلواری کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اُستاد کرم کی شاعری ایک خدا پرست اور مذہب پسند انسان کی فطری آواز ہے۔ اُستاد نے خود بھی ایک مقام پر یہی کہا ہے کہ صحیح رہنما اور ہادی وہی شخص ہو سکتا ہے جو اسلام دوست ہو۔

پھلواری کے مرتب میجر عبدالکریم صاحب کا بیان ہے کہ اُستاد کرم کی تربیت ایک بڑے ہی پاکیزہ ماحول میں ہوئی ۔ان کے والد ایک صوفی بزرگ تھے۔وہ بہت

بڑے موحّد اور پابندِ صوم وصلواۃ تھے۔ان کی پھوپھی بڑی عابدہ اور عفت مآب خاتون تھیں۔ان کے چھوٹے بھائی الہ دین ایسے متقّی تھے جنہوں نے بچپن سے لیکر وفات تک نماز ہمیشہ باجماعت ادا کی۔اسی ماحول کافیضان تھا کہ استاد کو مذہبی' اخلاقی اور عرفانی اقدار سے بے پناہ عقیدت ہوگئی اور شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ یہ لگن پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ان کا بیشتر کلام اسی عقیدت کا اظہار اور انہی اقدار کا پرچار ہے۔

استاد کرم نے جس موضوع کواپنی شاعری کی بنیاد بنایا وہ دنیا کے کئی نامور شعرا کا موضوع سخن رہا ہے۔ دانتے' رومی' ملٹن' سعدی' اور علامہ اقبال کاکلام اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ مذہب عظیم شاعری کامصدرِالہام رہاہے۔ حافظِ شیراز بلا شبہ دنیا کا عظیم ترین غزل گوہے۔ اسکا دعویٰ ہے کہ علم و حکمت اور قرآنی تعلیمات کا جو امتزاج میرے کلام میں ہے وہ دنیا میں کسی اور کے یہاں نہیں۔

ز حافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد
لطائفِ حِکَمی با نکاتِ قرآنی

ایک اور جگہ پہ اس نے اسی بات کواس پیرائے میں ادا کیا ہے

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظؔ
بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

یعنی وہ سمجھتا ہے کہ اسکی شاعری کا جمال اور تاثیر اس قرآن کافیضان ہے جواس کے سینے کے اندر محفوظ ہے اوراس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ حافظ نے قرآن سے متاثر ہو کر ہی لاتَقْنَطُوْ کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اُردو میں مولانا الطاف حسین حالیؔ' مولانا محمّد علی جوہر' مولانا ظفر علی خان' اکبر الہ آبادی' اور علامہ اقبال کا کلام بالخصوص اسلامی اقدار کا ترجمان ہے۔ پنجابی میں حضرت سلطان باہو' حضرت بُلّھے شاہ' مولوی غلام رسول' اور حضرت میاں محمّد نے جو عارفانہ زمزمے چھیڑے ہیں ان کا سرچشمہ بھی یہی

اقدار ہیں۔

مشرقی شعرا کی روایت یہ رہی ہے کہ انھوں نے بالعموم دیوان کی پہلی غزل میں الٰہیاتی مضامین پر مبنی اشعار کہے ہیں۔ بقول علاّمہ عرشی "مسلمان مفسّر ہو یا محدّث، فقیہ ہو یا مورّخ، صوفی ہو یا شاعر اس نے اپنا اوّلین فریضہ یہی سمجھا ہے کہ اپنی تصنیف کا آغاز حمدِ باری سے کیا جائے۔

اس روایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اُستاد کرم نے بھی اپنے مجموعے کا آغاز اللہ تعالےٰ کی رحمتِ بے پایاں اور اپنے اعترافِ گناہ سے ہی کیا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

جتھ پیر تے نین پران میرے، تیری حمد مولا کر سکدے نئیں
میں روز آنواں روز جانواں، تسی کدی دیندے اکدے نئیں

حکم نہ مناں، مڑ کے فیر آنواں، تُسی کدی بوہے اگوں دھکدے نئیں
میں گناہ کردا کردا تھک گیاں، تُسی کرم کردے کردے تھکدے نئیں

اُستاد کو ذاتِ باری کی رحمتوں پر بے انتہا بھروسہ ہے۔ اس بارگاہ میں انہیں انسانی معذرتوں کی پذیرائیوں کا کامل یقین ہے۔ وہ اپنے اعترافِ گناہ میں بھی انتہائی خلوص مند ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میرے گناہ ہمالیہ سے بڑھ کر ہیں اور اللہ کا کرم سمندروں سے بڑا ہے۔

عبّاسی خاندان کے خلیفہ مامون الرّشید سے ایک قول منسوب ہے کہ اگر دنیا کو معلوم ہوجائے کہ مجھے معاف کرنے میں کتنا لطف آتا ہے تو لوگ میرے پاس اپنے گناہوں کے تحفے لایا کریں۔ یہ ایک انسان کا جذبہ درگذر ہے۔ انسانوں کے خالق کی لا انتہا رحمتوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ رحمتِ حق کے حضور میں استاد نے جگہ جگہ اپنے شعری نذرانے پیش کئے ہیں۔ جن جن شعروں میں رحمتِ ایزدی کے سامنے

اُستاد نے اپنی کوتاہی عمل اور ندامت کا تذکرہ چھیڑا ہے ان کا عجیب عالم ہے۔

ایسے سخت سیاہ سن عمل میرے کہ میں ٹھوکراں تھیں پائمال ہندا
پُرزے پُرزے کر چھڈدے لوک مینوں جدا جدا میرا وال وال ہندا

پتّھر برسدے وانگ منصورؔ مینوں گریبان دامن میرا لال ہندا
جے نہ ربّ دی ذات رحیم ہندی کرمؔ ویکھدوں کیہ تیرا حال ہندا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

توبہ بُھلیا ہن نئیں کراں گا میں ہنجھے اس طرح نال اقرار کیتا
کیتا عفو تساں تے درگذر کیتا نالے بخشنے دا اقرار کیتا

کیتا جنہاں مقابلہ نال تساڈے ،تساں اوہناں نوں وی تار پار کیتا
میں گناہ نڑینویں وار کیتے تساں کرم کیتا تے سو وار کیتا

اللہ کی رحمتِ بے پایاں کے ساتھ ساتھ اُستاد کرم نے فخرِ موجودات رحمت للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی سے بھی اپنی بے پناہ محبّت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار سے یہ عقیدت چھلکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ان کے نزدیک حضورؐ کی ذاتِ گرامی کے جمالِ مجسّم کے سامنے ساری کائنات کا حسن ماند ہے۔ حضورؐ کا اُسوہِ حسنہ عمل کی سچّائی کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔ آپ کی ہستی کا نور وہ مقدّس نور ہے جس سے ضیاءِ طور بھی جھجکتی ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے انسان کے سارے عُقدے حل گئے ہیں ۔ آپ کی عزّت و ناموس پر قربان ہوجانا سب سے بڑی سعادت ہے۔

اُستاد کے نعتیہ کلام کے تذکرے کے بعد میں ایک ایسے مضمون کی طرف آرہا

ہوں جس میں مجھے استاد کی حیثیت بڑی منفرد دکھائی دیتی ہے۔ ہماری فارسی اور اُردو شاعری کی ایک روایت یہ رہی ہے کہ شیخ و واعظ پر طنز و اِستہزا کے بڑے کٹیلے وار کئے گئے اور یہ سلسلہ اس قدر دراز ہوا کہ حدِ اعتدال سے بڑھ گیا۔یہاں تک کہ تمام مقدّسات سے شوخی روا رکھنے کی رسم پڑگئی۔ رفتہ رفتہ ہر مذموم چیز محمود اور ہر محمود چیز مذموم قرار دی گئی ۔ مسجد وکعبہ کے مقابلے میں صنم خانے اور مے خانے کے قصیدے پڑھے گئے ۔ بت پرستی کی طرفداری کی گئی۔ بہت ممکن ہے کہ بعض دبی ہوئی عصبیتوں نے ادب میں سازش نے یہ گُل کِھلائے ہوں اور پھر لوگ نادانستہ طور پر اس رسم کو نبھاتے چلے گئے۔

یہ بجا کہ نام نہاد واعظین نے سادہ لوحوں کااستحصال کیا ہے اور لوگوں کوروحِ مذہب سمجھانے کی بجائے ظواہر کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ یہ منافقانہ طرزِ عمل بلاشبہ قابلِ گرفت ہے۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آدمی سچ نہ بولنے والوں سے نفرت کرتے کرتے سچّائی کی مخالفت پر کمر باندھ لے۔ کسی کی کوتاہی عمل سے شعائرِ دینی کی توہین کا جواز تو نہیں نکلتا۔

اُستاد کرم کی عظمت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کا دامن اس غلط روایت کی تقلید سے قطعی پاک ہے۔ اُستاد نے شیخ وبرہمن کوبالکل معاف کردیا ہے۔ ایک مقام پر اگر یہ قصّہ چھیڑا بھی ہے تو صرف اس قدر کے اے واعظ ترے ڈراوے مجھے رحمتِ حق سے مایوس نہیں کر سکتے۔

ایویں کرم تائیں کہنائیں دوزخی توں ،بخشش رب دی اے کہ تیرے باپ دی اے

دراصل اُستاد کو اپنے گریبان کے جائزے نے اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ دوسروں کے گریبانوں سے اُلجھتے بلکہ وہ تو اپنے اعترافِ گناہ میں مگن ہیں۔

کرم وال ہو گئے سفید میرے باطن ہو گیا توے دے رنگ دا اے

استاد کرم کے مذہبی تصوّرات کے سلسلہ میں ان کی ایک طویل نظم 'توبہ' کا ذکر انتہائی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ نظم عرقِ انفعال کے موتیوں کی لڑی ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ گناہ کی پھسلن سے محفوظ رہنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کے عظیم ترین انسانوں نے بھی خدا کی بارگاہ میں یہ الفاظ کہے ہیں کہ اے اللہ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر توُ نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اُستاد کرم کہتے ہیں کہ میرے سر پر گناہوں کی گٹھڑی لاکھوں من بھاری ہے۔ لیکن پھر بھی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ اس کی نظرِ عنایت ہو تو شور زمین میں بُھنے ہوئے دانے اُگ سکتے ہیں۔

جنھاں کلراں تے پے گئی نظر تیری ' اوتھے بھُجیا موٹھ اُگائی دا اے

اس نظم میں اُستاد نے عظیم پیغمبروں کے حالات و واقعات کو قرآنِ مجید کے پس منظر میں بیان کیا ہے اور ساتھ ساتھ حضورِ حق میں ان جلیل القدر ہستیوں کے اعترافات کو بنیاد بنا کر اپنی گزارشِ مغفرت بھی دہراتے چلے گئے ہیں۔

یارحیم توبہ یاکریم توبہ ' یا ستّار توبہ' یا غفّار توبہ
کرم کریں توبہ استغفار توبہ' توبہ توبہ ہے میرے ستّار توبہ

نظم کے آخری حصہ میں اُستاد نے اپنے دوستوں سے اپنی توبہ کی گواہی مانگی ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ روزِ حشر بھی میری اس توبہ کی شہادت دی جائے۔
دراصل یہ نظم توبہ کے اسلامی عقیدے کی تفسیر ہے کہ یہاں پر کسی ازلی اور ابدی گناہ کا کوئی تصوّر نہیں۔ انسان اگر اصلاحِ احوال کے پر خلوص جذبے کے ساتھ اپنے گناہوں پر نادم ہو کر معذرت خواہ ہو تو قیامت تک کیلئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ ذات جورات کی سیاہی کو دن کے اجالے سے ڈھانپ سکتی ہے وہ سیہ کاری کے

اندھیرے کو بھی مغفرت کے نور سے بدل سکتی ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان۔ یعنی زمین پر ہر چیز فانی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے انکار کی جرأت اس شخص کو بھی نہیں ہو سکتی جو مذہب پر اعتقاد نہ رکھتا ہو۔ زندگی کی بے ثباتی اور فنا پذیری ایک عالمگیر موضوع ہے۔ بعض شعرا نے تو اس دُکھ کو کلیجہ سے لگالیا ہے۔ ایران کا عظیم رباعی گوشاعر عمر خیّام فنا کے مضامین کو مختلف اسالیب میں بیان کرنے کا متخصص ہے۔ وہ اپنی خلوتوں اور انجمنِ دوست میں اسی غم کے لاشے کو لئے لئے پھرا ہے۔ اس کی حُزنیہ لَے چیخ چیخ اٹھتی ہے

این کوزہ چو من عاشق زارے بودہ است
در بندِ سرِ زلفِ نگارے بودہ است
این دستہ کہ بر گردنِ او می بینی
دست ایست کہ بر گردنِ یارے بودہ است

وہ یہاں تک کہتا ہے کہ محبوب کے چہرے سے گرد کو بڑی آہستگی اور شائستگی سے صاف کرو کیونکہ یہ گرد بھی تو کبھی کسی خوبصورت نازنین کا چہرہ تھی۔

علّامہ شبلی نعمانی نے 'شعرُالعجم' میں لکھا ہے کہ خیّام سعدی سے بڑا معلّمِ اخلاق ہے۔ اس اعتبار سے یہ بات بڑی برحق ہے کہ اگر خوفِ مرگ سے خوف آخرت اور خوف خدا پیدا ہو جائے تو پھر اصلاح کیلئے کُن مکُن کی تفصیلات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر ایک حسّاس لمحہ بھی انسانی زندگی پر طاری ہو جائے تو زندگی میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

اُستاد کرم کی حسّاس طبیعت بھی زندگی کے اس پہلو کی نشاندہی کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اُستاد نے جس شدّت سے اس کرب کو محسوس کیا ہے اس شدّت سے اسے جا بجا بیان بھی کیا ہے۔ اُستاد کے نزدیک زندگی دیوارِ قہقہہ کے اس پار کا عالم ہے۔جو

یہاں سے چلے گئے دیوارِ قہقہہ کے اِس پار پہنچ گئے۔ اس دنیا کی حقیقت یہ ہے۔

دنیا کیہ اے کجھ وی کرم ناہیں ننگے آوندے کفن تلاش کر دے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ زندگی اذان اور نماز کے درمیان کا مختصر وقفہ ہے

جد میں آیا تے کرم اذان ہوئی ہو گئی نماز تے چلیا میں

خیال رہے کہ یہاں پر استاد نے زندگی کے اختصار کو اسلامی اصطلاحوں میں ہی بیان کیا ہے

اُستاد کے یہاں بے ثباتی کے اظہار کے کچھ اور پیرائے ملاحظہ ہوں۔

میخوار آباد سن کدی جتھے اوتھوں ٹھیکری ملے پیمانیاں دی
وین دنیا توں ہو فراموش بیٹھے محفل لبھدا کتھوں مستانیاں دی
خزاں خاک اُڈاکے نس گئی چھت اُڈدی پھرے کاشانیاں دی
شمع رُو جتھے کرم وسدے سن اوتھے ملے گی خاک پروانیاں دی

ٹمٹماوندا اے پیا ویکھیا ای اے چراغ ای صبح سویریاں دا
غنچہ چمن اندر پیا ٹہکدا اے مہمان دو گھڑی اوریاں دا
کامل چودہ زوال ہے پندرہ نوں نئیں اوں ویکھیا چن ہنیریاں دا
کرم جوبن نوں کیہ پیا سمجھنا ایں میری جان ایہ کاگ بنیریاں دا

دنیا کی کوئی محفلِ طرب اور بزمِ نشاط پائیدار نہیں

سر سبز اوہ ہووے آباد کیکر' بنیاد ای جدی فناں رہی
بستی عشق دی اُجڑی پجُڑی اے' ویکھی جدوں کردی ہاں ہاں رہی
کوچے عاشقاں سدا ویران پئے' ہُوں ہاں رہی نہ چُوں چاں رہی
کرم کدی وی کسے نوں ویکھیا ای' سدا یار دے گلے وچ بانہہ رہی

'چرخہ ہن نئیں چلدا' حیاتِ زودگذر پر اُستاد کی ایک بے نظیر نظم ہے۔ چرخہ دراصل انسانی جسم کا استعارہ ہے جو بچپن اور جوانی کی منزلوں میں بڑا خوش آہنگ اور سبک رفتار ہوتا ہے لیکن موسمِ شباب کے ڈھلتے ہی اس کی رفتار مدّھم پڑجاتی ہے اور پُرزے ڈھیلے ہونے لگتے ہیں۔

ٹٹ گیا بیڑ تے ماہلاں ڈِھلیاں ڈِگ پیاں چمڑیاں ہِل گیاں کلیاں
یاد پیاں تیاں دی کھلیاں جنہاں وچ عمر وہانی
بُڈھیا پھیر پھیر پچھتانی

اس چرخے کی کتنی ہی دیکھ بھال کیوں نہ کی جائے اسے شکست کے انجام سے کوئی قوّت نہیں بچا سکتی۔

بھجیا چرخہ بالن بندا یا پیا رُلدا یا پیا سڑدا
کرم کریں میرا دل پیا ڈروا توں سُنیاں رحمانی

بُڈھیا پھر پھیر پچھتانی

لیکن اس احساسِ فنا کے ساتھ ساتھ اُستاد کرم کے کلام میں ایک اور لہر اسی طرح بہتی چلی جاتی ہے جیسے ہاتھ پر زندگی کی لکیر کے متوازن کوئی معاون لکیر چل پڑی ہو اور وہ لہر یہ ہے۔

میں کہیا چرخہ رُوں رُوں کردا ایہہ نئیں تاں فِر گھُوں گھُوں کردا
اوہ دراصل سی توُں توُں کردا' ناں میں سمجھی دیوانی

بُڈھیا پھر پھیر پچھتاتی

یعنی بدن کے سنکھ میں سانس کی زنجیر ہردم بجتی ہے اور انسان کو اس وعدۂ الست کی یاد دلاتی ہے جسے وہ بھول بیٹھا ہے۔ مختصر یہ کہ احساسِ فنا کی شدّت کے باوجود استاد کرم اپنے آپ کو اپنے بنیادی حوالے سے منقطع نہیں کرتے اور استاد کا یہ سفر پریشانی پر ختم نہیں ہوتا۔ اسی حوالے کی مدد سے ان کے اندر روزِ جزا کی تیاری کا مثبت جذبہ پیدا ہوتا ہے اور فکرِ روزِ حساب چونک پڑتی ہے۔

شاید اوہو قیامت دا روز ہوسی 'جدوں نیناں پراناں نے بولنا ایں
کیہ کجھ لکھیا اے کس نے لکھیا اے کس نے واچنا ایں کس نے پھولنا ایں
جانے ربّ کیہڑا پلّا ہوئے بھاری' جانے بوجھ اعمال کس تولنا ایں
خبرے اوس نے کرم کیہ پچھنا ایں' خبرے مری زبان کیہ بولنا ایں

اس فکرِ عقبیٰ کا استاد نے بار بار ذکر کیا ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ سفرِ آخرت کا سامان درست کیا جائے کیونکہ وہاں پر خالی جھولی لیکر جانا اچھا نہیں۔ بقولِ سعدیؔ

بہ شہر قیامت مرو تنگدست

استاد کی سب سے بڑی پہچان مسلم قومیّت کا احساس اور مذہبی حمیّت کا جذبہ ہے۔ غازی علم دین کی شہادت کا پس منظر' ۱۹۳۰ء میں کشمیر میں قرآنِ مجید کی بے حرُمتی اور مسجد شہید گنج کی واگزاری کا مسئلہ' ان واقعات نے استاد کی قومی اور ملّی غیرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ استاد کو اس بات کا انتہائی قلق تھا کہ غیر مسلموں نے تمام اخلاقی اقدار اور رواداری کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے مذہبی

جذبات کوٹھیس پہنچائی۔ ان افسوسناک واقعات سے متاثر ہو کر اُستاد نے بڑی جوشیلی نظمیں لکھیں۔اُستادکی شاعری اپنی قومیت کے تحفّظ اور حفظِ وقار کے لئے رزمیہ لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔ان منظومات میں انھوں نے مسلمانوں کی غیرت کو بیدار کرنے کے لئے ان کی رزم آرائیوں اور شجاعتوں کے قابلِ فخر کارناموں اور پرشکوہ جہانبانیوں کا ایک ایک واقعہ دُہرایا ہے اور استاد کے کلام میں تاریخی شواہد اور اسلامی تلمیحات کا ایک سیلاب بہہ نکلا ہے۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ آج اسلام کو لوگوں نے مذاق سمجھ لیا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے آج وہ لوگ قہقہے لگاتے ہیں جنہیں کبھی خواب میں بھی ہنسنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی نامسلمانی ہے جس نے یہ دن دکھائے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے ناموسِ محمدیؐ پر فدا ہو جانے کا وعدہ لینا چاہتے ہیں۔

ٹھوکو بانس وچ سیخ تے راس کرلو تُسی کیہ قواعد نوں جاندے او
صفاں توڑ کے صفاں وچھا دیو تُسی عدو کم بخت دے ہان دے او

تہاڈا اُکدا کدی نشان ناہیں، تُسی تیر اک بڑی کمان دے او
تہانوں اپنے زور دی خبر ناہیں، تُسی بڑے جنگی خاندان دے او

چلو خنجر ہلال نوں باہر کڈھو مُڑ کے باڑھ اُسنوں دُوجی وار دے او
پیارے نام محمدؐ توں چلو یارو تُسی اپنی جان نوں وار دے او

اُستاد کا یہ محکم عقیدہ ہے کہ مسلمان کمانِ ایزدی کا تیر ہے۔اگرچہ اس کی شوکتِ رفتہ مٹ چکی ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ جذبۂ جہاد کو تحریک دی جائے تاکہ پھر اللہ کے وہ پُراسرار بندے پیدا ہوں جوسوائے اسکے اور کسی سے ڈرنا نہیں جانتے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود قرآنی تعلیمات 'احادیث اور اسلامی تاریخ پر اُستاد کی نظر کتنی گہری ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں اپنے مذہبی تصوّرات کو

بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کاکلام ایک سچّے مسلمان کا کلام ہے جو خدا کی رحمت سے مایوس ہونا نہیں جانتا۔جسے نبی اکرمؐ کی ذاتِ والا صفات سے عشق ہے۔ جو دینِ اسلام کو تمام ادیان سے افضل سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کا محکوم اور محروم اقتدار ہونا جس کے لئے باعثِ حیرت ہے۔ جس کی دینی حمیّت انتہائی حسّاس ہے اور شوقِ جہاد جس کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔

اس وقت نہ صرف پاکستان کو بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے جوزبردست چیلنج در پیش ہے اس کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ ہمارے اندر سر فروشی کے جذبات کوزندہ کیاجائے۔ اور یہ روحِ جہاد اسوقت تک بیدار نہیں ہوسکتی جب تک ہماری مذہبی حمیّت بیدار نہ ہو۔ یہ ایک نا قابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ دوسری قوموں نے اپنے مذہب کوچھوڑا اور ترقّی کی منازل طے کیں لیکن مسلمان اپنے مذہب سے بیگانہ ہوا تو زوال پذیر ہوتاچلا گیا۔ ہمیں پھر سے اپنے قومی تشخّص کی پہچان کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے اُستاد کرم کے کلام کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرز کی شاعری کا تحفّظ اور ترویج لازمی ہے۔

اُستاد کی شاعری پنجابی زبان کی لطافتوں کا مرقّع ہے اسلئے کہ اُستاد کو پنجابی کی فطری نغمگی سے آگاہی حاصل ہے۔ اُستاد کا پیکر شعر خالصتہً پنجابی ہے اور اس کی روح سراسر اسلامی تعلیمات سے اِلہام پذیر ہے۔ اُستاد کی شاعری ہماری تہذیب کی نمائندہ شاعری ہے۔ ایسی شاعری ہمارا قومی حافظہ ہے جس کوزندہ رکھنے کی ہم پر ذمّہ داری عائد ہوتی ہے -

"پھلواری" کی اشاعت کااہتمام میجر عبدالکریم صاحب کی ایک ادبی اور دینی خدمت ہے جس کا جتنا اعتراف کیا جائے کم ہے -

اسلم کمال اوسلو میں

اسلم کمال کے اس سفرنامے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میرا پہلا مسئلہ اس مضمون کی عنوان بندی تھا۔ یہ کتاب اتنی پہلودار اور اپنے اندر اتنا کچھ سمیٹے ہوئے ہے کہ اس کی سطروں اور سطروں کے درمیان سے گذرتے ہوئے ذہن میں عنوانات کا ایک میلہ سا لگ گیا ہے۔ سب سے زیادہ رومانٹک ' بے ساختہ اور برجستہ عنوان جو تجویز ہوا وہ یہ تھا کہ 'سیالکوٹ کا گبرو اور ناروے کی گبریلا' ۔ ایک عنوان تقسیم سے قبل بننے والی ایک ہندوستانی فلم کا نام بھی ہو سکتا ہے اور وہ ہے ' یہودی کی لڑکی ' ۔۔ اور اسلم کمال کے فن کی مناسبت سے اس مضمون کو ' مثلّث ' کے عنوان سے معنون کیا جائے تو یہ بھی انتہائی موزوں قرار پاتا ہے اس لئے کہ مثلث اسلم کمال کی کیلی

گرانی کی تکوینی اور اساسی فارم ہے اور اس کتاب کی رعایت سے اس تکون کا ایک زاویہ تو خود اسلم کمال ہے دوسرا زاویہ وہ پردیس یا PARADISE جسے ناروے کہتے ہیں اور ان دونوں زاویوں سے اونچا زاویہ ناروے کی وہ بانکی نار ـــــ کہ اسلم کے بقول جس کے حسن کی تابانی سے یورپی نشاۃِ ثانیہ کی مصوّری روشن ہے ـــــ ایک ایسی عورت جو انسان کے خیالوں اور خوابوں میں ستاروں کے آشیانے اور شمس و قمر کے نشیمن بنانے کا ہنر جانتی تھی۔

مجھے بھی ناروے جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہ بھی صرف اوسلو میں اور وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لئے۔ اسلم وہاں چھ مہینے تک مقیم رہا اور اس نے اوسلو' اوسلو کے مضافات اور ناروے کے دیگر حسین ترین مقامات کا گوشہ گوشہ چھان مارا ـــــ اس کی نگاہ ناروے کے جسم کے رُوئیں رُوئیں میں پھر گئی۔ میں نے وہاں پر ہر طرف پھیلی ہوئی صرف ایک سفید چادر دیکھی۔ میں ان دنوں وہاں پہنچا جب ناروے نے برف کی بُکل مار رکھی تھی ـــــ گلاب کے پھول کپاس کے پھول بن گئے تھے ـــــ میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گیا جب کہ اسلم کمال اپنی مصوّری کی نمائش کے لئے۔ اسلم کے اس سفر کی داستان پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر میرا شدّت سے جی چاہا کہ اے کاش میں بھی اس دلیس میں اسلم کے ساتھ ہوتا۔ کتنا بے مہر ہے کیسے کیسے جلمکاتے جمگھٹوں اور جھرُمٹوں میں ہمارے بغیر ہی پھرتا رہا۔ شعر اور تصویر میں آخر فاصلہ ہی کیا ہے ۔ لفظ بھی تو لکیر کی ایک گنگناتی ہوئی صورت ہے اور بقول عبدالرحمٰن بجنوری مصوّری سُرمہ آواز شاعری ہے ـــــ کاش اسلم اپنے کسی آئندہ کے دور دیس کے سفر میں ہماری ان حسرتوں کو دھیان میں رکھے ـــــ یہاں پر مجھے پنجابی کے دو مختلف گیتوں کے مُکھڑے بغل گیر ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ـــــ سانوں وی لے چل نال وے ـــــ اساں ہور مندیاں کیہ کہنا ـــــ میرے مقدّر میں تو ناروے

جاتے ہوئے منیر نیازی صاحب کی ہم سفری کا شرف لکھا ہوا تھا۔ یہ تجربہ بھی ایک یادگار تجربہ تھا۔ منیر صاحب کی شاعری جمال آفرینی کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ اور وہ خوبصورت DIALOGUE کے بہت ہی رسیا ہیں۔ لیکن اس سفر کے دوران ان کی صرف دو باتیں بار بار یاد آتی ہیں۔ اس لئے کہ یہی باتیں ان کی زبان سے بار بار سننے کا اتفاق ہوا۔ جب کبھی بڑے تمکنت کے مُوڈ میں ہوتے تو اپنا تعارف اس طرح کراتے:۔

"میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلّق رکھتا ہوں۔۔ کھاتا کم ہوں اور پیتا زیادہ ہوں"

اور جب تمکنت جلال اور ہیبت کی ہمرکاب ہو جاتی تو اپنے مخاطب کو ان الفاظ میں دھمکی دیتے:۔

"اوئے کا کائے قلت !میں تیرا سرتن سے جدا کرکے فٹ بال ٹیم کے حوالے کر دوں گا"

میرا یہ جملہ معترضہ اپنے ماسبق سے پوری طرح مربوط ہے۔ آپ اسلم کا سفرنامہ پڑھئے تو میرے اندر پھوٹتی ہوئی اسلم کی ہمراہی کی خواہش' خواہش بے جا معلوم نہیں ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلم کو قدرت کی طرف سے بہت کچھ ودیعت ہوا ہے۔ کتنے ہی کمال اس کی شخصیت میں اکٹھے ہو گئے ہیں جن کا شکر اسلم پر ہی نہیں ہم سب ہم وطنوں پر واجب ہے۔ وہ ایک بے مثال مصوّر ہے اور مصوّرانہ خطّاطی میں ایک منفرد دبستان کا بانی ہے۔ میں نے کچھ سال پہلے اسلم کی خطّاطی پر ایک نظم لکھی تھی۔ اس موقع پر اس کے دوچار شعر ضرور سنانا چاہوں گا۔

یہ جو اسلم نے کیا ہے خطِ تازہ ایجاد
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھّا کہئے

کوفی و نسخ کی آمیزشِ نادر ایسی
دلفریبی میں جسے غیرتِ طُغریٰ کہئے

قامتِ قیس سے تشبیہ الف کو دیجئے
بائے حُطّی کو خمِ گیسوئے لیلیٰ کہئے

کیوں نہ اسلم کے کمالِ فنِ خطّاطی کو
جنّتِ مردُمکِ دیدۂ بینا کہئے

میرا دل پوری طرح مطمئن ہے کہ اسلم کی مصوّرانہ خطّاطی کے بارے میں اس تاثّر کا اظہار کرنے میں کسی مبالغے کا مرتکب نہیں ہوا۔

اسلم کی مصوری کا دوسرا پہلو اس کے ہاں کھڑکی کا استعارہ ہے جو مفہوم کے ہزاروں دریچوں کو وا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اسلم کی مصوری کاسب سے زیادہ قابلِ قدر پہلو کلامِ اقبال کے جلال و جمال کی ILLUSTRATION ہے۔ مختلف نمائشوں کے دوران ناروے میں اسلم کی مصوّرانہ خطّاطی' ونڈو سیریز WINDOWSERIES اور شعرِ اقبال کی تصویری تشریحات کو بے پناہ مقبولیت اور مثالی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ایسی پذیرائی کہ ہر نمائش میں مصوّری کا ذوقِ سلیم رکھنے والی حسینانِ صف بہ صف' بیاضِ آرزو بکف اسلم کے آٹوگراف کے لئے لپکتی رہی ہیں۔

میں جب ناروے پہنچا تو ناروے کی ایک خاتون نے مجھے بڑے اشتیاق سے بتایا کہ آپ کے آنے سے پہلے آپ کا ہم وطن ایک مصور بھی یہاں آیا تھا۔ اس نے آپ کے ایک عظیم شاعر کو بڑی ہنرمندی سے PAINT کیا ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس کی مصوری کو دیکھ کر آپ کے دل میں کیا تاثّر پیدا ہوا تو وہ کہنے لگی کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ شخص (اقبال) اپنے ہم وطنوں کو اندھیروں سے اجالوں کی

طرف لے کر جانا چاہتا ہے۔ یہ تبصرہ سُن کر مجھے محسوس ہوا کہ اسلم کمال نے کتنی کامیابی کے ساتھ پیغامِ اقبال کی ترسیم اور ترسیل کی ہے اور میرے ذہن کو یہ بصورت تلازمہ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّور کی آیہ مبارکہ کی تجلّیوں کی طرف لے گیا۔

اسلم کمال کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بہت عمدہ شاعر بھی ہے۔ اگر وہ شعر پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا تو اس بات کا بھرپور امکان تھا کہ اس کی مصوری اس کی شاعری سے پیچھے رہ جاتی۔ آپ نے اس کا یہ شعر ضرور سنا ہو گا۔

اسلم ہے میرا نام کمال اس کا نام ہے
رہتے ہیں اک مکاں میں مگر بولتے نہیں

اسلم نے اپنے سفرنامے میں اپنی ابتدائی زندگی کے کچھ واقعات بھی قلمبند کئے ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ پانچویں چھٹی جماعت میں تھا کہ اچھے خاصے افسانے اور نثر پارے تحریر کرنے لگا تھا۔ یہ کتاب اس کی شخصیت کے اس پہلو کا بہت ہی توانا اظہار ہے۔ وہ اوسلو گیا اور وہاں پر بیتے ہوئے ایک ایک لمحے کو اپنی یادوں کے ریشمی غلاف میں باندھ کر لے آیا۔ یہ کتاب اس ریشمی غلاف کے کھُلنے کا ایک نثری پیرایہ ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک سفرنامہ ہے لیکن اس میں ہماری نثری اصناف اور بالخصوص FICTION کی ساری جھلکیاں موجود ہیں۔۔ منظر کشی بھی، کردار نگاری بھی، مکالمہ بھی، زعفران کے چھینٹے بھی اور استعجاب کے حیرت آفریں پیرائے بھی۔

کوئی شخص اگر تحریر کے آئینے میں ناروے کی پوری تصویر دیکھنا چاہتا ہے تو اسلم کمال کے سفرنامے کا مطالعہ اس کے لئے ناگزیر ہے۔ اتنی تھوڑی مدت قیام میں کسی اجنبی دیس کا اتنا بھرپور مطالعہ شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ ناروے کی تاریخ، اس کا

جغرافیہ' اس کے حسین مناظر' اس کے مشاہیر' فنونِ لطیفہ' لوگوں کے مذہبی اور جذباتی رویّے' ان کے شب و روز' وہاں کی آرٹ گیلریز' میوزیم' درونِ خانہ اور بیرونِ خانہ سرگرمیاں ' خورودنوش کی پسند و ناپسند' صنفِ نازک کے لباس اور بے لباسی کی جھلکیاں' ازدواجی رسوم و قیود سے بیگانہ روی اور نئی نسل کے لچّھن مختصریہ کہ وہاں کا پورا تہذیب وتمدن پورے اعدادوشمار کے ساتھ اسلم نے اس کتاب کے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔

ناروے کے عظیم فن کاروں' مجسّمہ سازوں' ادیبوں' شاعروں اور موسیقاروں کی زندگیوں اور کارناموں کو اسلم کے قلم نے پوری تفصیل کے ساتھ ریکارڈ کیا ہے۔ اس ملک کے نوبل انعام یافتہ مشاہیر کو اسلم نے خاص طور پر بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے اُردو زبانِ جہان فن کے ایک نئے اُفق سے پوری جامعیت کے ساتھ روشناس ہوئی ہے۔

مجسّمہ سازی' مصّوری اور موسیقی کے رموزونِکات کے بارے میں اسلم نے اتنی معلومات جمع کر دی ہیں جیسے کسی نے خزانے کا منہ کھول دیا ہو۔ اسلم نے ناروے کے عظیم مجسمہ ساز ویگیلاند کی تخلیقی عمل کے بارے میں کیسی بصیرت افروز کوٹیشن نقل کی ہے۔

"تخلیقی جوہر ایک تحفہ ہے اور یہ تحفہ بہت مقدّس ہے۔ فنکار خود نہیں جانتا کہ یہ مضامین کہاں سے آئے اور کس طرح اس کی ذات میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ تخلیقی عمل ہر طرح کے تجزیہ اور وضاحت سے بالاتر ہے۔ آرٹ کے تمام بڑے کارنامے گذشتہ نسلوں سے مکالمہ کرتے ہیں اور ہر ایک نسل ان کی اپنے اپنے انداز سے تعبیر کرتی ہے۔"

اس ضمن میں اسلم نے خود بھی بڑے خیال انگیز نکتے بیان کئے ہیں۔ ایک ماڈل کی

سکیچنگ کرتے ہوئے اسلم اس لائن کے بارے میں لکھتا ہے جو ماڈل کے قریب تو بہت واضح تھی لیکن اس سے دُور ہوتے ہی معدوم ہو جاتی تھی۔

"تب میں نے جانا کہ رنگ، اس کی کمیّت اور کرشمے کے ارتباط سے ظاہر ہونے والے ٹیکسچر کے دشتِ حیرت میں کیسے کیسے سراب ہوتے ہیں۔ جہاں پر روشنی کے بجائے صرف اس کی چمک ہوتی ہے، سایہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا شائبہ ہوتا ہے، رنگ کی جگہ پر اس کا محض نیرنگ ہوتا ہے اور جہاں پر لائن نظر آتی ہے وہاں پر صرف لائن کا احساس پایا جاتا ہے۔"

اسلم کا اُسلوبِ تحریر مصورانہ ہے۔ وہ ہر چیز کو لفظوں میں پینٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ وہ جب کسی منظر کو بیان کرتا ہے تو گردوپیش کے سارے مناظر اس کے ایک منظر میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک تصویر تصویر در تصویر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ باطنی کیفیات اور داخلی واردات بیرونی مناظر سے ہم آہنگ ہو کر ایک طلسماتی harmony پیدا کر دیتی ہیں۔

مصوّر ہونے کے ناتے رنگوں کے بارے میں اسلم خاص طور پر بڑا حسّاس ہے۔ اس کی کتاب کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس پر یہ دھنک موجود نہیں۔ گرے (GREY) رنگ اس کا پسندیدہ رنگ ہے۔ اس کے بقول "یہ راکھ کا رنگ ہے اور میں نے اپنے خوابوں، خیالوں، جذبوں اور خواہشوں کی چکا چوند کو اسی راکھ سے اُجاگر کیا ہے"

فوٹوگرافی کی ایک دکان کی ایک ملازم خاتون کے لباس کا جائزہ اسلم نے رنگوں کے حوالے سے اس طرح لیا ہے۔ "سرخ رنگ کے جاگرز، نیلے رنگ کی پینٹ پر گلابی رنگ کی قمیض جس پر کالے رنگ کی جیکٹ ہوتی، ہاتھوں میں پیلے رنگ کے دستانے اور بازو پر سبز رنگ کا پرس جھولتا ہے اور کالی سفید دھاریوں والے مفلر سے اپنے خوبصورت بالوں والے سر کو دہاتنوں کی طرح کس کر باندھے وہ اپنی تمام رعنائی اور

جملہ دلربائی کا ستیاناس کرتی چلتی ہے۔"

اسلم کے سفرنامے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ — آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں — وہ ایک سچّا اور کھرا پاکستانی ہے۔ اس نے ناروے میں رہنے والے پاکستانیوں اور ان کی بے لوث پاکستانیت کو بڑی گہری محبت اور اخلاص میں بھیگے ہوئے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ایک پاکستانی خاتون تو جگنو کی طرح کبھی کبھی اور کہیں کہیں دکھائی دی ہے لیکن سارے سفر نامے پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ اسلم کا سب سے بڑا راز بنی بیٹھی ہے۔ پاکستان سے ٹوٹ کر پیار کرنے والی یہ خاتون اپنے دل کی مُٹّھی میں ایک استفسار لئے پھرتی ہے۔ وہی استفسار جس نے پاکستان کو اہلِ مغرب کی نظروں میں سب سے بڑا راز بنا رکھا ہے۔ اس راز کے سلسلے میں اسلم کو جب بھی کوہِ بے ستوں کی طرح کریدا اور کھودا گیا تو اسلم کے اندر سے روشنی کی ایک نہر نکلی ہے۔ اس نے گزارشِ احوالِ واقعی میں سرِمُو انحراف نہیں کیا اور رموزِ مملکت میں دخل دینے سے پوری طرح احتراز کیا ہے۔ اس نے اس سوال کے جواب میں صاف کہہ دیا ہے کہ ہم کوئی بحران پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ بس اپنے ایک بحران کا سدِّباب کرنے کی تگ و دو کر رہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے کارخانے چلتے رہیں اور دیئے جلتے رہیں۔ ہمارے خلاف غلط قسم کا پراپگنڈا وہ ملک کر رہا ہے جو بظاہر آشتی کا دم بھرتا ہے اور گھر کے اندر بیٹھا چپکے چپکے زہریلے بارودوں سے بم بھرتا ہے۔

اسلم کے سفرنامے میں Pathos سے لبریز مناظر بھی موجود ہیں۔ اپنی مانوس کتیا سے بچھڑنے والی ۸۰ سالہ کیتھرین کی بے کسی کا دردناک منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔ حسین خواتین کے ساتھ علمی اور فنی مباحثوں کے درمیان اُبھرنے والی رومانی شگفتگی کی جھلکیاں بھی ہیں۔ ایسے مناظر بھی ہیں جن سے اسلم کے بدن میں برقی رو دوڑتی رہی۔ ایسی خواتین بھی ہیں جو اپنے بدن کا حسن تناسب کیش کرتی ہیں —ایک موقع پر ایک

خاتون نے جب اپنے لائٹر سے اسلم کا سگرٹ سلگایا تو اسلم نے خاتون کے دانتوں پر لائٹر کے شعلے کے انشکارے کا بڑی دِقّتِ نظر سے مشاہدہ کیا۔ یقیناً وہ اس وقت مسکرا رہی ہو گی۔ یہ پڑھ کر مجھے پنجابی کی ایک بولی بے ساختہ یاد آئی۔

"پُت جٹ دا بڑا نُٹ پینا تے ہسدی دے دند گِندا"

اسلم کے سفرنامے میں ان خواتین کی طویل فہرست ملتی ہے جو اسکی زبردست فین تھیں اور ان سب کا اپنا اپنا مقام تھا۔ کوئی ٹیبل فین، کوئی پیڈسٹل فین، کوئی سیلنگ فین اور کوئی ایگزاسٹ فین۔ اسلم سے اس بے تکلفی کے اظہار کی معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اسلم نے گبریلا اور اس کے شوہر کے سامنے یہ عہد کیا تھا کہ

"میں آپ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا"

وہ اپنے قلم کے کرشمے سے ان لوگوں کو جس طرح اپنے ساتھ لے کر آیا ہے

کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

البتہ اپنے قلم کی توانائی سے اس نے اوسلو کی ساری یادوں کو اپنے سفرنامے میں بڑے دلکش اور سحرانگیز اسلوب سے محفوظ کر دیا ہے۔ اسلم کی تحریر میں مصوّر کے ساتھ اس کے اندر کا شاعر بھی شامل ہو گیا ہے اس نے رمزوایما اور بالخصوص کنایہ سے اپنے اسلوب بیان کو سجایا ہے۔ اس کی انگلیوں میں مُو قلم ہو یا قلم وہ اس کو یکساں مہارت سے استعمال کرتا ہے۔

اسلم کمال چند مہینوں کے لئے اوسلو میں رہا اور اب اوسلو ہمیشہ کے لئے اسلم کمال میں رہے گا۔

بشیر مُنذَرِ کی یاد میں

حلقہ ارباب غالب نے بشیر منذر مرحوم کی یاد میں آج کی شام یہ جو خصوصی اجلاس منعقد کیا ہے ایک انتہائی قابلِ تحسین اقدام ہے اس لیے کہ ادب کے حوالے سے بشیر منذر کی شخصیت بلاشبہ اتنی جامع ہے کہ ادبی حلقوں کے لیے اسکی یاد آوری ایک اہم فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں حلقے کے سیکرٹری جناب یوسف حسن صاحب کا بے انتہا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس اجلاس میں شرکت کی دعوت بھیجی اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ "تُساں مضمون وی ضرور پڑھنا اے " اس خصوصی اجلاس کا موضوع بھی پنجابی میں لکھا گیا کہ 'بشیر منذر مرحوم دی یاد وچ '۔ میں اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ منذر مرحوم صرف پنجابی کے ہی شاعر نہ تھے ان کا اردو کلام بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی دور میں بشیر منذر صرف پنجابی ہی میں شعر کہتے رہے لیکن کچھ عرصہ بعد پورے بیس برس تک

انھوں نے صرف اُردو زبان کو اپنا وسیلہِ اظہار بنائے رکھا۔اس دوران میں جب ایک موقع پر یہ صورتحال پیدا ہوئی کہ پوچھتے ہیں وہ کہ منذر کون ہے؟ تو منذر کو بڑے قلق سے یہ کہنا پڑا۔

منذَر ادب میں اب بھی مرا نام ہے نیا
گویا کہ میں نے بیس برس رائیگاں کئے

بشیر منذر مرحوم نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں تقریباً" تمام معروف انواعِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی اُردو نعتوں کا مجموعہ حفیظ تائب صاحب کے زیرِ اہتمام عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ انکی اردو غزلوں' نظموں اور گیتوں کا مجموعہ 'شاخ در شاخ' بھی زیرِ طبع ہے۔ 'فنون' کے جدید غزل نمبر میں بھی انکی غزلیں شامل ہیں۔انکی پنجابی منظومات کا مجموعہ 'کلا رکھ' کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

گیت کی صنف میں بشیر منذر کا Contribution بڑا منفرد ہے۔ اُردو اور پنجابی گیت نگاری میں اس نے یکساں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔پنجابی فلم 'یار بادشاہ' کے سارے گیت بشیر منذر کے لکھے ہوئے ہیں۔مسّرت نذیر کا گایا ہوا مقبول عام گیت ' آون گے کاں اڈا جان گے۔ سانوں نواں پواڑا پاجان گے ' بھی منذر مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔اس نے پنجابی کی لوک اصنافِ سخن میں بھی بڑے خوبصورت تجربے کئے ہیں۔ وہ ابھی پانچویں جماعت کا طالبعلم تھا کہ اس نے پنجابی میں ایک سی حرفی لکھی ۔میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس نے گجرات کے معروف ہفت روزہ' محبِّ کِسان ' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔منذر مرحوم نے ایک عرصہ تک ملک کے ممتاز روزناموں میں سیاسی اور سماجی موضوعات پر اعلیٰ درجے کے طنزیہ اور مزاحیہ اردو قطعات بھی لکھے۔یہ قطعات جمع ہوجائیں تو ایک الگ کتاب شائع ہو سکتی ہے۔اس مقام پر مجھے اس کاایک شعر بہت یاد آرہا ہے۔

رخصت ہوئے تو جانا سب کام تھے اَدھورے
کیا کیا کریں جہاں میں دو ہاتھ آدمی کے

یہ بات بھی ناگفتہ نہیں رہنی چاہیے کہ منذر مرحوم کے تینوں مجموعہ ہائے کلام
کلارکھ '' ابو مجھے بتائیں '' اور '' الھڑ بلھڑ باوے دا '' رائٹرز گلڈ کے انعام یافتہ ہیں۔

بشیر منذر سے میرا تعارف حفیظ تائب کے توسّط سے سن ستر کی دہائی کے آغاز میں
نیب روڈ کے مینار آرٹ پریس پر ہوا۔شاعروں اور ادیبوں کے ایک جھرمٹ کے
درمیان وہ اپنے حقّے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پریس بھی چل رہا تھا۔لطیفے بھی، گفتگو
بھی ، چائے کا دور بھی اور حقّہ بھی، دکھ سکھ اور دلداریوں کا سلسلہ اظہار بھی جاری تھا
اور شاعر غزلو غزلی بھی ہورہے تھے۔

مجھے ' جی آیاں نوں ' کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر جو پر خلوص مسکراہٹ پھیل
گئی تھی وہ میری یادوں کا بہت قیمتی اثاثہ ہے۔میں نے یہ محسوس کیا بشیر منذر اہل قلم
کے اس بھرے میلے کو disturb ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔اس دوران میں اگر
کوئی گاہک آن ٹپکتا تو بشیر منذر اس سے شتابی سے فارغ ہونے کی ہر ممکن اور معقول
تدبیر کر گزرتا تھا۔

مجھے اس آرٹ پریس پر سجنے والی بزمِ منذر کے طفیل مرزا ادیب گوہر
ہوشیارپوری، روحی کنجاہی، اسلم کمال، جلیل عالی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی،
حامد احمد اور کئی دوسرے نامور ادیبوں سے بھرپور ملاقاتیں میسّر آئیں ۔حفیظ تائب کا
مجھ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مجھے بشیر منذر سے متعارف کرایا۔ اس محفل اور
ایسے مردِ خلیق میرِ محفل میں اتنی کشش تھی کہ میں صرف اس محفل کا لطف اٹھانے
کے لئے راولپنڈی سے لاہور جانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔لاہور اور مینار آرٹ
پریس میرے لیے مترادف ہوگئے تھے۔کوئی مجھے پوچھے تو ایک روڈ کی دو ہی تاریخی
شخصیتیں ہیں۔ایک مسندِ دہلی کا لکھ داتا۔قطب الدین اور دوسرا مینار آرٹ پریس
والا۔۔بشیر منذر۔

نفسیاتی نقطہِ نظر سے کسی شخص کی ایک معمولی سی حرکت سے بھی اسکی شخصیت کا
بھرپور اندازہ ہوجاتا ہے۔ بشیر منذر کا حقہ پینے کا انداز اسکی شخصیت کا پورا مظہر

تھا۔ عموماً" دیکھا گیا ہے کہ جذباتی، غصیلے اور جلد باز لوگ فرصت یک دوکش پاتے ہی حقّے کی نوبی کو دھواں دھواں کر دیتے ہیں ۔۔۔۔۔ آوَن گے آکے دُھنا جان گے سانوں نواں پواڑا پاجان گے۔ اسکے بر عکس بشیر منذر کی حقّہ نوشی کے دوران میں نے حقّے کی نوبی کو ہمیشہ پر سکون اور بے دُود پایا۔ وہ بڑے نرم ملائم اور دھیمے انداز میں کش لگاتے تھے اور حقّے سے بھی بڑا بیبا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہی نرمی اور دھیما پن انکی شخصیت کا امتیازی وصف تھا۔

بشیر منذر کی سادگی کے بارے میں حفیظ تائب کا تبصرہ شنیدنی ہے اور یہ معمولی اور طائرانہ تبصرہ نہیں چوالیس سالہ پر خلوص رفاقت کے تجربے کی گواہی ہے۔ تائب صاحب 'کلا رکھ' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اوہ سِدّھا سادا تے نیک دل انسان اے۔ ہراک نال خلوص نال پیش آوندا اے۔ سِدّھا اوہ ایڈا اے کہ ہر کوئی ہر ویلے اونہوں دھوکھا دے سکدا اے۔ پر اوہنوں دھوکھا دین لئی کسے دا دل گھٹ ای راضی ہو سکدا اے۔ سادہ تے لائی لگ ایڈا اے کہ اوہنوں جدھر مرضی لا لیئے۔"

وہ بھولپن اور معصومیت کا ایک عجیب پیکر تھا۔ عمر کے آخری حصے تک اسکی یہ صفت اس سے جدا نہیں ہوئی۔ میں نے بار دیکھا کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر بھی غیر معمولی حیرت کا اظہار کرتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھا۔ گفتگو میں کبھی شریک ہوتا بھی تو ہیں "جی"! اور "ہلا جی"! کے تحیّر آمیز الفاظ کہہ کر چپ ہوجاتا تھا۔ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربے اور واقعات اس طرح سناتا جیسے کوئی بڑی راز کی باتیں سنا رہا ہے۔

اس سے میری آخری ملاقات اسکی رحلت سے تقریباً" دو ہفتے پہلے لاہور میں پروفیسر ارشاد صدیقی کے گھر پر ہوئی۔ میں نے اس سے خیریت پوچھی تو اپنی عادت کے برعکس اس نے اپنی بیماری اور علاج کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور آدھ گھنٹے تک اس موضوع پر بولتا رہا۔ ان دنوں وہ ایک ہومیوپیتھ کے زیرِ علاج تھا اور معالج تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پروفیسر ارشاد صدیقی ان دنوں بنگلہ دیش سے ہو کر

تازہ تازہ واپس آئے تھے۔انھوں نے بنگلہ دیش کے حالات تفصیل سے بیان کرنے شروع کردیئے۔ انھوں نے بتلایا کہ بنگالی بھائیوں کو ہم سے جو نفرت تھی وہ اب کئی گنا زیادہ ہو کر ہندوستان کی طرف منتقل ہو چکی ہے اوراب وہ پاکستان اور پاکستانیوں سے بڑی محبت کا اظہار کرتے ہیں -بشیر منذر بڑی حیرت کے ساتھ ارشاد صدیقی پر سوالات پر سوالات کرتا رہا۔ارشاد صدیقی چونکہ جماعت اسلامی کے بڑے سرگرم متفقین میں سے ہیں بشیر منذر نے ان سے بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی کی حیثیت کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ارشاد صدیقی نے بتایا کہ وہاں کی جماعت نے صحیح لائنوں پر کام کرنا شروع کر دیاہے اور اب وہاں اسکی جدّوجہد عوام کی معاشی اور مالی بدحالی کا تدارک کرنے کے لئے وقف ہوگئی ہے اور اس نے دہاتوں میں بڑا رسوخ حاصل کر لیا ہے۔

بشیر منذر بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سارے واقعات سنتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بنگلہ دیش کے سارے حالات جان لینے کا متمنّی ہے۔ تقریباً" دو گھنٹے تک یہ گفتگو ہوتی رہی اور اس گفتگو میں وہ اپنے لفظوں اور اظہارِ حیرت کے ساتھ پوری طرح شریک رہا۔

کاش میں اسکی اس خلاف معمول پُرگوئی سے اندازہ کر سکتا کہ میرے ساتھ اسکی یہ آخری ملاقات ہے ۔ارشاد صدیقی کے گھر پر وہ چند لیٹرپیڈز کے پیکٹ لے کر آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ یہ جلیل عالی صاحب اور یوسف حسن صاحب کو پہنچا دیجئے۔ ان کی یہ امانت میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔وہ اس درجے کا دیانتدار تھا کہ لاہور میں محکمہ بحالیات کے ملازم کی حیثیت سے اس نے بعض معروف لوگوں کو کوٹھیاں اور مکان الاٹ کروا دیئے لیکن اس بہتی گنگا میں وہ اپنے ہونٹ تر کرنے سے گریزاں رہا اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رائٹرز گلڈ کی جانب سے اسے پلاٹ الاٹ ہوا اور اس پر اس نے مکان تعمیر کیا بھی تو اسے بیچنے پر مجبور ہوگیا۔

بشیر منذر کی دوستی بے لوث تھی۔حرص اور حسد کا کوئی دھبہ اسکی روح پر نہیں

تھا۔ مرزا ادیب کا کہنا ہے کہ اپنی دوستی کے ۳۵ سالہ دور میں کم از کم میں نے کبھی بشیر منذر کی زبان سے کسی کے لئے کوئی سخت اور تُند لفظ نہیں سنا۔وہ اپنے آپکو دوسروں پر کبھی Impose نہیں کرتا تھا۔اسکی شخصیت میں کوئی بناوٹ اور کوئی تصنّع نہیں تھا۔وہ ان لوگوں میں سے تھاجنہیں انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ They Are Tmemselves ۔ اسکی شخصیت کا مجموعی تاثّر یہی بنتا ہے کہ وہ ایک مخلص ،نرم خو، نیک دل ،سادہ اور جیا انسان تھا۔

مجھے فارسی کے ایک جدید شاعر کے مجموعہ کانام ''تکدرخت '' یعنی '' تنہا پیڑ '' بہت پسند آیا ۔میرا جی چاہا کہ اُردو یا پنجابی میں بھی کوئی مجموعہِ کلام اس نام کا ہم معنی ہونا چاہیے۔ میری خواہش اپنے دوستوں کے مجموعہ ہائے کلام کے ناموں کی شکل میں پوری ہوئی۔خورشید رضوی کا مجموعہ '' شاخِ تنہا '' اور بشیر منذر کا '' کلّارکھ '' ۔
بشیر منذر کے بارے میں حفیظ تائب لکھتے ہیں کہ:۔

'' اوہ ماہیاں دا اکلّا کارا پترا اے۔ ایس واسطے اکلاپے واحساس اوہدا سب توں وڈّا احساس اے۔ایسے لحاظ نال اوہدی اپنی ذات وی اک کلّا رکھ اے''

اسکا دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ۔ شہر بھی اسکو راس نہ آیا اور گراں بھی چھُوٹ گیا۔ تعلیم اور شہری زندگی نے اسے ایسا بنادیا کہ اب گاؤں کے رسم و رواج بھی اسے کھلنے اور کھٹکنے لگے اور موجودہ شہری زندگی کی ساری اقدار بھی اسکے نزدیک شائستہ اعتبار نہیں۔ اسے اپنا کوئی محرم نہ شہر میں ملتا ہے اور نہ گاؤں میں۔اسکی نظموں میں اسی احساس تنہائی کی نا آسودگی سرایت کئے ہوئے ہے۔ '' کلارکھ '' اسکی ایک نظم کانام ہے لیکن اس نے اسی نام کو پوری کتاب کا نام قرار دے دیا اسلئے کہ یہ نام بشیر منذر کی اپنی ذات کا المیہ ہے۔ناموافق معاشرے میں ناقدری اور ناشناسی کے دکھ نے اسے اتنا حسّاس بنادیا ہے کہ اسے معاشرتی صورت حالات کے پس پردہ جھانکنے کی توفیق حاصل ہوگئی ہے۔سماجی ناہمواریوں کو بے نقاب کرنے کے لیے اس نے حرفِ سادہ میں گرہیں ڈالے بغیر بڑا دلآویز لہجہ اختیار کیا ہے جس میں اختصار بھی

ہے اور تاثر بھی۔ بات اَدھوری مگر اثر دُونا۔

کلاڑھ کی نظموں کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں۔

"جیہڑا آدمی سادے شعراں نوں سادے معنی پہناندا اے اوس تے بشیر منذر دیاں نظماں ہسدیاں ہون گیاں کہ ایہہ پڑھن والا وچارا کنّاں سادہ اے ایناں نظماں دے پچھے جیہڑی اک دنیا گڑلاندی تے گوکدی اے اوس تک صرف اوہو پڑھن والا پہنچ سکدا اے جیہڑا جاندا ہووے کہ سادگی دی مٹھاس دیاں تہواں ہیٹھاں کنیّاں گجھیاں گجھیاں تہاں تے کوڑیاں کوڑیاں حقیقتاں چھپیاں ہندیاں نیں"

عارف عبد المتین بشیر منذر کی شاعری کو جاگتی آنکھ کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ ان خال خال انسانوں میں سے ہے جن کی اندر کی اور باہر کی آنکھ ہمیشہ جاگتی رہتی ہے۔اس نے اپنے سماجی مشاہدات پر جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے اسکی بدولت ہمارے ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔

کلاڑھ کی پہلی نظم "نیں جیون دی" اپنے اختصار اور گہری معنویت کے لحاظ سے کوزے میں دریا کی مثال ہے۔ اس مختصر سی نظم میں ایک متحرک علامت سے زندگی کی کشمکش، اسکی پسپائیوں، پیشقدمیوں، کامرانیوں اور شکستوں کو بڑے بلیغ اشاروں میں بیان کیا گیا ہے اور پھر جزوی حقیقت کُلّی حقیقت کا روپ دھار کر عرفان کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔

نیں جیون دی وگدی جاوے
ڈبدا سورج، چڑھدا سورج
اک دن جاوے، اک دن آوے
پلاں دی گن من رکھوں وٹے
کوئی نہ سمجھے، کوئی نہ جانے
دور پیا کوئی کھڑ کھڑ ہسّے
کیہڑے شوہ دریا وچ پیندی

گھنڈی ودھدی ودھدی گھنڈی
رُڑدی، رُڑدی، ڈِگدی ڈھیندی
پل پل جندڑی مُکدی جاوے
چڑھدا سورج ڈُبدا سورج
نیں جیون دی مُکدی جاوے

اسکی نظم ' مہاندرا ' کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ بڑی بے حیا ہونگی وہ آنکھیں جو اس نظم کو پڑھ کر نم آلود نہیں ہوتیں ۔بات۔تو صرف اتنی ہے کہ بچّے کا ناک نقشہ اپنے باپ سے ملتا ہے لیکن اس حوالے سے بشیر منذر نے معاشرتی جبر کی پیدا کردہ قباحتوں، محرومیوں اور ناانصافیوں کو اسطرح بے نقاب کیا ہے کہ پڑھنے والے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اسکی نظم ' سکھنی گُتھلی ' اس المیے کی روداد ہے کہ معاشرتی حیثیتوں کا تعیّن صرف پیسے کے پیمانے سے ہوتاہے۔یہ نظم بے زری اور زرداری کے موازنے کی ایک بے نظیر مثال ہے۔

اُچّی گردن دھنواناں دی
جیوں دیوے دی جوتی
نردھن اتھے بن کے رہندے
جنے کھنے دی کھوتی
سکھنی گُتھلی بھوئیں اتے
لمّی پے جاوے
جس گُتھلی وچ مایا ہووے
رہندی کھلی کھلوتی

دسمبر ۱۹۷۳ء کے فنون میں ' کلا رکھ ' پر پروفیسر جلیل عالی کا ایک جامع تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جلیل عالی نے اس تبصرے کو ان الفاظ میں Sum up کیا ہے۔

"مختصر یہ کہ بشیر منذر کی شاعری کا تاروپود جس احساس تنہائی سے تیار ہوا ہے وہ

احساسِ تنہائی اپنی نوعیّت کے اعتبار سے ہمارے معاشرے کے حاشیائی فرد (Marginal Man) کی نفسیات سے اُبھرنے والا احساس تنہائی ہے اور یہ کہ گاؤں اور شہر کے معاشرتی بُعد (Social Distance) سے جنم لینے والی ثقافتی خلیج نے ہی بشیر منذر کو ایک حاشیائی فرد بنایا ہے"

بشیر منذر کی نظموں میں افسانے کاسا انداز، گیت کاسا اختصار اور غزل کی سی اشاریت ہے۔ اسکی بیشتر نظموں کے آخری مصرعے یا آخری لفظ ایکدم چونکا دیتے ہیں۔اس کالہجہ مجھے شریف کنجا ہی صاحب کے اسلوب کے بہت قریب محسوس ہوا ہے۔ شاید اسے لئے کہ دونوں کے مزاج میں دھیما پن ہے اور دونوں کے ہاں کنجاہ کی پنجابی کی مٹھاس رچی ہوئی ہے۔دونوں کے ہاں دِھیرے دِھیرے کُڑھنےاور سلگنے کی کیفیت بھی ایک قدرِ مشترک ہے۔

تر لکڑی کی مانند سلگتا ہوں شب و روز
کیا آگ ہے مُنذِر کہ جلے ہے نہ بجھے دل

بشیر منذر کی ان نظموں میں اسکی چوتھائی صدی کی فنّی مہارت صاف دکھائی دیتی ہے۔ زبان اور بیان پر اسکی قدرت ہر مصرعے سے پھوٹی پڑتی ہے۔یہ سب نظمیں سچی واردات اور سچے جذبے کی پیدا وار ہیں۔ وہ اپنے احساس کی تصویروں میں اپنے لہو کا رنگ بھرتا ہے۔ اس کاانداز سادہ، نویکلا اور نرالا ہے جو سیدھا دل میں اُتر جاتا ہے۔

بچوں کے لئے اُردو نظمیں لکھنے والے شعرا میں اسمٰعیل میرٹھی، چراغ حسن حسرت، قیوّم نظر اورصوفی تبسّم کے بعد نمایاں ترین نام بشیر منذر کا ہے۔منذر کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے پنجابی میں بھی بچوں کے لیے بڑی پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں۔اُردو کی ان نظموں کے مجموعے 'ابو مجھے بتائیں' کے حوالے سے حفیظ تائب لکھتے ہیں۔

"بشیر منذر کو طالب علم رہنے کا بہت شوق ہے یہی شوق شاید اس بچّے کا دوسرا

نام ہے جو ابھی تک بشیر منذر کی روح کے کسی گوشے میں چھپا بیٹھا ہے۔جس کی معصومیت اور مختلف حرکتوں سے بشیر منذر کو بے پایاں محبت ہے اور شاید یہی بچّہ اپنے ساتھیوں کے لئے بشیر منذر کے نام سے نظمیں لکھتا ہے۔اگر یہ بچّہ ابھی تک بشیر منذر کے اندر زندہ نہ ہوتا تو اس پیرانہ سالی میں ' ابو مجھے بتائیں ' جیسی خوبصورت نظموں والی کتاب کیسے لکھتا؟"

اس کتاب کی بہت سی نظمیں اور گیت ریڈیو پر اور ٹیلی ویژن پروگرام ' ہم کلیاں ہم تارے ' میں گائے جا چکے ہیں۔

بچوں کی شاعری کے لیے محبت 'پیار اور شفقت کے جذبات اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔' الھڑ بلھڑ باوے دا ' میں اس نے اس روح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو ماں کی مامتا سے عبارت ہے۔اور یہی روح اسکی اردو نظموں میں بھی رواں دواں محسوس ہوتی ہے۔

اُردو کی ان نظموں میں بشیر منذر نے بچّوں کی نفسیات سے کامل آگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ انکی خواہشات اور میلانات اور خوئے استفسار کو ایسے حسین اور خوش آہنگ پیرائے میں بیان کیا ہے جس سے دیکھی بھالی چیزوں سے بچوں کے نئے رابطے قائم ہوتے ہیں اورانہیں تازہ مسرّتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اخلاقی نِکات کو اس نے واعظانہ نہیں بلکہ انتہائی فنکارانہ اسلوب کے ساتھ بچوں کے ذہنوں اور دلوں میں اُتاردیا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ باہر کی دنیا میں بچوں کی دلچسپی کا سامان کیا ہے اور انکے اندر کی دنیا میں کونسی خواہشیں اچھلتی کودتی رہتی ہیں۔

اس نے بچوں کے اجتماعی حافظے پر دستک دی ہے۔ ننّھے مُنّے مقبول عام محاوروں اور ضرب الامثال کو کہانیوں کی شکل دے کر بڑی خوبصورت نظموں میں ڈھال دیا ہے۔ بچّوں کے لئے نظمیں لکھتے ہوئے جو شاعرانہ گنجائشیں اس نے پیدا کی ہیں اس سے پہلے کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ریل گاڑی پر اسکی نظم دیکھئے۔

آئے گاڑی جائے گاڑی
کیا کیا سیر کرائے گاڑی
اندر اسکے لگے ہیں میلے
باہر اسکے جنگل بیلے
کتنے رنگ دکھائے گاڑی
آئے گاڑی جائے گاڑی

وقت کی ہے یہ تیز سواری
اس کا سفر دن رات ہے جاری
تھکنے کبھی نہ پائے گاڑی
آئے گاڑی جائے گاڑی

پیچھے جو بھی رہ جائے گا
ہاتھ ملے گا پچھتائے گا
سب کو یہ سمجھائے گاڑی
آئے گاڑی جائے گاڑی

بشیر منذر کی انفرادیت اور اسکا امتیازی وصف یہ ہے کہ اسکی ہر نظم بڑی خیال انگیز ہے۔اور بچّوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔اس اعتبار سے اسکی نظم ' ابو مجھے بتائیں ' ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔بسا اوقات تُتلاہٹیں ایسے گھمبیر سوال پوچھ بیٹھتی ہیں کہ بڑے بڑے فلسفیوں سے ان کا جواب نہیں بن پڑتا۔

ابو مجھے بتائیں۔ جگنو دن بھر سوئیں
راتوں کو کیوں جاگیں ؟ مشعل لے کر بھاگیں

ابو مجھے بتائیں- مرغی کے انڈے میں
چوزہ کہاں سے آئے؟- دانہ کون کھلائے؟

ابو مجھے بتائیں- دنیا کیوں لڑتی ہے؟
جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ مائیں کیوں روتی ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ بچّوں کے لئے اتنی خوبصورت، مترنّم اور فکر انگیز شاعری کی اُردو زبان میں اور کوئی مثال نہیں- حفیظ تائب نے بہت درست کہا ہے کہ "یہ نظمیں بچّوں اور بڑوں کو یکساں متاثّر کرتی ہیں- ان میں بڑی شاعری کے تمام جوہر موجود ہیں- بشیر منذر نے بچوں کی شاعری کو نئے اُفق اور نئی راہیں دکھائی ہیں-

جن دنوں بشیر منذر کی کتاب "الھڑ بلّھڑ باوے دا" شائع ہوئی تھی اس نے مجھ سے بھی اس کا فلیپ لکھنے کی فرمایش کی- اسکی یہ کتاب پڑھکر اسوقت میں نے جو کچھ محسوس کیا اور لکھا اس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے-

"بچپن وچ ذہن دی تختی تے جیہڑے نقش پے جاندے نیں اوہناں دے اثرات بڑے ڈونگھے ہوندے نیں- ایہ اک بڑی وڈی نفسیاتی حقیقت اے- شاید ایسے لئی مسلماناں نوں ایہ حکم دتّا گیا اے کہ ہر نولولود نوں سب توں پہلاں اذان دا ترانہ سنایا جاوے- ایہ نفسیاتی سچائی نظر وچ ہووے تے آپے سمجھ آجاندی اے کہ بچیاں لئی ادب تخلیق کرنا کوئی بچیاں دی کھیڈ نئیں- بشیر منذر نے بچیاں واسطے جیہڑیاں نظماں لکھیاں نیں ایس کامل آگاہی ناں لکھیاں نیں کہ پہلی اِٹ ونگی رکھ دتی جائے تے کندھ اسماناں توڑی ونگی ٹرجاندی اے- ایہناں نظماں وچ اوپرے پن دا احساس نئیں ہوندا- ایسے وگلے بشیر منذر نے اپنے وطن دے معصوم لوک ورثے نوں گواچن نئیں دتّا بلکہ اوہنوں اپنے تہذیبی ورثے وچ گُنّھ کے اک نویں صورت وچ پیش کیتا اے- اک ایسی صورت جیہڑی بچیاں دے دلاں وچ انسانیت دیاں بلندیاں ول سفر کرن دا اُدّم پیدا کردی اے-

"ایہناں نظماں دی سب توں وڈّی خوبی ایہہ وے کہ جیہڑے بچّے ایہناں نوں پڑھن گے تے جیوں جیوں وڈے بندے جان گے اوہناں دے ذہن وچ ایہناں نظماں دیاں کلیاں وی پھُل بندیاں جان گیاں تے فیر اوہناں نوں پتہ لگے گا بشیر منذر چڑیاں طوطیاں راہیں زندگی دیاں بڑیاں ڈُونگھیاں رمزاں سمجھا گیا ئے۔"

"بشیر منذر دے شفیق لہجے وچ بچیّاں نوں ٹافیاں دا سواد آوے گا۔ بچیّاں لئی پنجابی وچ نظماں دی ایہ پہلی کتاب اے۔ ایس فصل دی پنیری بشیر منذر نے لائی اے۔"

بشیر منذر کی اردو غزل ایک الگ موضوع ہے۔ 'کلاّ رکھ' کی اشاعت کے ساتھ ہی 'شاخ در شاخ' کے نام سے منذر صاحب نے اسکے زیرِ طبع ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن انکی زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہو سکی۔ کاش رائٹرز گلڈ' اکادمی ادبیات یا کوئی اور ادارہ اسکی اشاعت کا اہتمام کرے تاکہ بشیر منذر کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ باقاعدہ صورت میں منظرِ عام پر آجائے۔ اسکی غزل کے چند شعر سنا کر اجازت چاہتا ہوں۔ میرا مختصر تاثّر یہ ہے کہ اسکی غزل ایک ایسا دریا ہے جس میں مختلف سوچوں اور کیفیتوں کے سفینے تیرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی بھنور کی زد میں اور بیشتر ساحلوں کے آس پاس۔ ایک درویشانہ سے آہنگ میں حسرت بھری فریاد کی ایک دھیمی سی لَے سنائی دیتی ہے اور 'آپے دل بالیا تے آپے بہہ کے سیکیا' والی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

ملاحظہ فرمائیے۔

اچھّے کبھی بُرے ہیں حالات آدمی کے
پیچھے پڑے ہوئے ہیں دن رات آدمی کے

سر پہ اک سائباں تو رہنے دے
جل گیا گھر دُھواں تو رہنے دے

درد اُٹھّے تو اسے وہم سے تعبیر کروں
میں بہر طور ترا نام چھپانا چاہوں

ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے
رو لیتے ہیں ہم رات کے آنچل سے لپٹ کے

زیست کی ناؤ نہ جانے کس کنارے جا لگے
ملگجی سی دُھند ہے اِس پار بھی اُس پار بھی

شوق چاہے کہ ابھی اور بگولے اٹھیں
وسعتِ دشت مری آبلہ پائی مانگے

رات دن رسوا سرِ بازار ناکامی رہے
ہم بایں گوشہ نشینی کس قدر نامی رہے

مستقل خطرات بام و در پہ منڈلاتے رہے
دل کی بستی کے سدا حالات ہنگامی رہے

بیٹھے بیٹھے جل اُٹھتی ہیں بھیگی بھیگی آنکھیں
پانی میں اک آگ لگا کر پھر وہ شام نہ آئی

اور آخر میں اس کا وہ معروف شعر جسے پڑھتے ہی وہ خود شدّت سے یاد آنے لگتا ہے۔

موت لے جائے گی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مرجائیں گے!

جمشید مسرور ـــــ سمندر پار کی ایک پاکستانی آواز

جمشید مسرور نے اپنے مجموعہ کلام ' میری خوشبوئیں میرے پھول ' کا انتساب اپنے مرحوم والدین کے نام کیا ہے اور اپنے والد گرامی جناب ڈاکٹر مسرور کپور تھلوی پر اس کتاب میں ایک نوحہ بھی لکھا ہے۔ اس نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ فن شعر گوئی کے اسرار و رموز اس نے تمام تر اپنے والدِ گرامی سے سیکھے ہیں جو خود بھی صاحب دیوان اور نہایت اعلیٰ شاعر تھے۔

فیصل آباد منتقل ہونے سے پہلے جناب مسرور کا قیام زیادہ تر گجرات میں رہا۔ وہ زمیندار کالج گجرات کی ڈسپنسری کے انچارج تھے۔ یہ میری انتہائی خوش نصیبی ہے کہ اس کالج میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں مجھے ڈاکٹر مسرور صاحب کو بہت قریب

سے دیکھنے کا موقع ملا ۔ وہ بیماریوں کے جراثیم کا قلع قمع کرنے پر مامور تھے لیکن کسی طالب علم کے اندر شاعری کے جراثیم دیکھ لیتے تو بے انتہا مسرور ہوتے اور ایسے جراثیم کو خوب پروان چڑھاتے۔ اس اعتبار سے انہوں نے مجھے خصوصی توجّہ کا مستحق سمجھا۔ جمشید اگر اس بات پر فخر کرتا ہے کہ اس نے شاعری کے رموز اپنے والد محترم سے سیکھے تو میری حوصلہ افزائی میں بھی انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ اور میں اس اعتراف کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتا ہوں ۔

علاّمہ اقبال کے انتہائی قریبی دوست گرامی جالندھری مسرور مرحوم کی بڑی پسندیدہ شخصیت تھے ۔ ان کے اشعار اور زندگی کے واقعات وہ بڑے والہانہ پن سے سنایا کرتے تھے ۔ مسرور صاحب کی زبانی سنا ہوا گرامی مرحوم کا ایک لطیفہ مجھے اب تک یاد ہے۔ گرامی آٹھوں پہر فنافی الشعر رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ حقّہ بھر کے لائے ۔ معلوم ہوا کہ ملازم نمازِ ظہر ادا کرنے کیلئے مسجد کو گیا ہے۔ گرامی صاحب پھر شعر کی دنیا میں کھوگئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے ملازم کو پھر حقّہ بھر کے لانے کا حکم جاری کیا ۔معلوم ہوا کہ وہ عصر کی نماز پڑھنے کے لئے گیا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر کسی شعر کی فکر میں ڈوب گئے ۔ مغرب اور عشاء تک یہ سلسلہ اسی ترتیب سے جاری رہا ۔ آخری بار جب انہیں ملازم کی جانب مسجد جانے کی اطلاع موصول ہوئی تو صرف ایک جملہ کہہ کے پھر فکر سخن میں گم ہوگئے کہ سالا قربِ مسجد کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے ۔

مسرور مرحوم کی زندگی میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی اور انکی شاعری میں بھی ایک رندانہ للکار سنائی دیتی تھی۔ شعر بھی بڑی ترنگ میں پڑھتے تھے ۔ ان کا لہجہ اس دور کے تھیئٹریکل (Theatrical) آہنگ کی بہت خوبصورت نمائندگی کرتا تھا ۔ میں ان کی غزل کے دوچار شعر آپ کی نذر کرتا ہوں ۔ کاش کہ میں ان کے شعر ان کے

انداز میں پڑھ سکتا!

جنہیں نفرت ہے مستانِ جہاں سے
وہ لے آئیں فرشتے آسماں سے

صبوحی نوشِ بزم میکدہ ہوں
بہت پہلے میں اُٹھتا ہوں اذاں سے

یہ کیفیّت' یہ لغزش ہر قدم پر
کہاں ہے ؟ قبلۂ عالم کہاں سے؟

وہی مسرور ہے شیخِ حرم آج
نکالا کل جسے کوئے بتاں سے

جن دنوں میں بی اے میں پڑھتا تھا جمشید کے دل پر شعر کی دیوی اپنی دستک دے چکی تھی۔ وہ بہت خوبصورت شعر کہنے لگا تھا۔ مجھ سے اور عاصی رضوی مرحوم سے اس کی بڑی گھنی دوستی تھی۔ ان دنوں اس نے پنجابی میں بھی بڑی دلدوز روما نوی نظمیں لکھیں جو وہ اپنے مخصوص ترنّم کے ساتھ سنا تا تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔ میں نے اس کی آواز کے تاثّر کو دامن دل میں سنبھالے رکھا اور اس نگہداشت میں کم و بیش تیس برس بیت گئے اور یہ صاحبِ آواز نہ جانے کہاں جا کے چھپ گیا۔

چند سال پہلے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے میں اوسلو پہنچا تو وہاں جاکر

معلوم ہوا کہ میرا یارِ گم گشتہ ایک مدّت سے ناروی ہو چکا ہے ۔ جمشید کو میرے آنے کا علم ہوا تو اس نے فوری طور پر ٹیلیفون پر مجھ سے رابطہ قائم کیا ۔ میرے میزبانوں نے یہ تکلّف ضرور کیا کہ مجھے جمشید سے دوچار لمحے ہمکلام ہونے کا موقع فراہم کیا ۔ جمشید مجھے اپنے ہاں ٹھیرانے پر مصر تھا لیکن مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میرے میزبانوں کے لئے اس سے زیادہ اذیّت ناک کوئی بات نہیں ہے کہ میری اور جمشید کی دوبارہ فون پر بھی ملاقات ہو سکے ۔ اسلئے کہ ان کے اور جمشید کے درمیان کشیدگی کا ایک صحرا پھیلا ہوا تھا اور وجہ خصومت وہی تھی جو خلوص مندی اور تاجرانہ ادبی روش کے مابین ہوتی ہے — پھر اچانک یوں ہوا کہ جمشید مجھے ملنے کے لئے اس محفل میں آدھمکا ۔ وہ ایک عجیب محفل تھی ۔ میرے ہم سفر جناب منیر نیازی بھی وہاں موجود تھے اور ایک شخص ایسا بھی جس کے کل پرزے تو پاکستان میں بنے تھے لیکن وہ ہندوستان جاکر assemble ہوا تھا ۔ وہ اُمّ الخبائث کے نشے میں بھی چور تھا اور بدگوئی کی مستی سے اس کی زبان بھی بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی — جمشید کی غیر متوقّع آمد سے محفل کا جو رنگ ہوا محتاج بیان نہیں ہے — البتّہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ صرف مجھ سے ملنے کے لئے اس نے قتلِ اَنا کا وہ لمحہ قبول کرلیا تھا۔ جمشید کا یہ اخلاص دوستی میں عمر بھر نہیں بھول سکتا — میں اس کے والد گرامی کا بھی مرہونِ منّت ہوں اور خود اس کا بھی مجھ پر بڑا احسان ہے — اسکے بعد اس سے میری ایک ملاقات پاکستان کے ایک مشاعرے کی ہیڑ دبڑ میں ہوئی۔ یہ مشاعرہ شاعروں سے اتنا لدا ہوا تھا کہ سامعین میں سے ایک لڑکا بہت بلند آواز میں یہ کہہ کر کھسک گیا "کیہ کریئے جی ؟ ایس سال ہدوانانے شاعر ہویا ای بڑا اے " یعنی کیا کیا جائے کہ اب کے برس تربوز اور شاعر پیدا ہی بہت ہوئے ہیں —— اور پھر اس کے بعد 'میری خوشبوئیں میرے پھول' کے مطالعے سے مدّت کے بعد جمشید سے بھرپور ملاقات ہوئی ہے ۔

اس مجموعے میں قطعات بھی ہیں ، رباعیات بھی ، غزلیات بھی اور نظمیں بھی۔ جمشید کی غزل وصل و فراق کی کیفیتوں اور حسن کی تجلّیوں سے لبریز ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ قریہِ حُسن کے گوشے گوشے کی سیاحت پر نکلا ہے۔ اس کے یہاں برآمدہ اور برنیامدہ ارمانوں کا ایک ہجوم ہے ۔ ناروے میں آباد ہوجانے کے باعث احساس مسافرت کی خلش نے بھی اسے بے چین کر رکھا ہے ۔

پڑے ہیں شہرِ سفر میں سبھی کفن لے کر
کوئی بدن کی کوئی روح کی تھکن لے کر

میں تو اس شہر میں اس وقت نہیں ہوں لیکن
میرے اس شہر میں وہ لوگ تو رہتے ہوں گے

احوال وطن کے بارے میں بھی جمشید بڑا حساس ہے ۔

چاند کا زخم کھلا رات کی ویرانی میں
اجنبی ساحلوں پر یادِ وطن کی صورت

وہ اپنے وطن میں مسندِ عدالت و منبر و دستار کی خوئے استحصال کے ہاتھوں سخت نالاں ہے اور ایک صحت مند انقلاب کا آرزو مند ہے اور اس انقلاب کے لئے ایسا جذبہ چاہتا ہے جو کچھ کر گذرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور اگر یہ توفیق نہ ہوتو ایمان کی وہ کمزور ترین سطح تو میسّر ہو جو برائی کو بد دعا دے سکے ۔

جمشید کا محکم عقیدہ ہے کہ ادب دربار سے تعلق بڑھاکر ضعف کا شکار ہوتا ہے اور اس کی توانائی حسنِ کردار پر منحصر ہے — جمشید کی غزل میں ناروے کے حسین مناظر اور وہاں کی زندگی کے شب و روز کی جھلکیاں بھی جابجا دکھائی دیتی ہیں۔ وہاں کے معاشرتی اختلاط کے پس منظر میں حسن کی ارزانی اور فراوانی سے ایک اُکتاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔

ہر جلوۂ جمال سے تنگ آچکا ہے جی
اک روز زندگی سے بھی بھر جانا چاہئے

جمشید کی غزل کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وصفِ لبِ لعلیں کا جو وفور اس کے یہاں ہے وہ مجھے اور کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں نے ایک کاغذ پر جمشید کے وہ شعر جمع کرنے چاہے جن میں ہونٹوں کا ذکر آیا ہے۔ کتاب کے چند صفحے پلٹنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہاں تو لالہ و گلبرگ و یاقوت کے ڈھیر لگے ہیں۔ کم قباؤں سے لب بہ لب رہنا تو اسکے دلِ مہذب کا مشغلہ ہے یہ دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غزلوں میں بکھری بکھری قوسِ لب کی جمع آوری کے لئے تو ایک کاغذ نہیں بلکہ کاغذوں کا ایک دستہ درکار ہے۔ اس سلسلے کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

صبر کرتے تو لبِ یار کو وا ہونا تھا
حرفِ انکار سہی کچھ تو عطا ہونا تھا

شعاعِ نور مرے ذہن پہ اُترتی ہے
کہ تیرگی سے تری قوسِ لب اُبھرتی ہے

رچی بدن میں بدن سے تلاشِ جاں میں گئی
کہاں کہاں تری خوشبوئے لب بکھرتی ہے

جن میں تیرے نرم ہونٹوں کی نمی کی باس تھی
ان نگاہوں میں جہنّم زار دہکائے گئے

ہوائے گُل کی مجھے ہو گئی ہے عادت سی
مرے قریب رہو غنچۂ دہن لے کر

کبھی تو آ مری ویرانیوں کے موسم میں
کنارولب کے مہکتے ہوئے چمن لے کر

لا پاس لبوں کے یہ سلگتے ہوئے خم
دو برف کی ڈلیاں بھی مرے جام میں ڈال

دل کسی تال پہ یوں رقص کناں ہے جمشید
کرشن کے لب سے جھڑے جیسے رگِ ساز کا رنگ

یاد آتے رہے وہ ہونٹ وہ آنکھیں وہ بدن
کھا گیا چاندنی راتوں کا الاؤ مجھ کو

لب و رخسار سے کیا فیض ملے گا جمشید
آگ ہاتھ آئے گی شعلوں کی شناسائی میں

میں انہی چند اشعار کی نشاندہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ جمشید کی شاعری ہونٹوں کے تذکرے سے لبریز و لبالب ہے۔ اس کے یہاں شعرہائے لبدار اتنی تعداد میں ہیں کہ دنیا میں لپ سٹک کے shades کی تعداد بھی اتنی نہیں ہوگی۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ناگفتہ نہیں رہنی چاہئے کہ جمشید ہونٹوں کا ایسا expert اور specialist شاعر ہے کہ اس حوالے سے معاشرتی جبر اور سیاسی گھٹن کو بھی بڑے قرینے سے بیان کرجاتا ہے۔

دی صدا پیار کی زرتار کرن کو لیکن
رات نے بڑھ کے مرے ہونٹ پہ اُنگلی رکھ دی

میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں جمشید اپنے والد محترم کی روایت سے تقریباً" تین انچ کے برابر انحراف کا مرتکب ہوا ہے۔ بے شک ڈاکٹر مسرور مرحوم کی فطرت کیلئے بھی حسن بتاں بجلی کا حکم رکھتا تھا لیکن ان کی شاعری اس بات کی غمّاز ہے کہ وہ ایسے کُشتۂ لب نہیں تھے جتنے قتیلِ چشم تھے۔ شاید یہ اپنے اپنے زمانے کی بات ہے۔

ڈاکٹر مسرور مولانا حالی کے ہمنوا ہو کر اس بات کی پُر زور تلقین کیا کرتے تھے کہ

شاعری میں جوشِ کلام بنیادی چیز ہے۔ خود ان کی شاعری میں بھی یہ پہلو بہت نمایاں تھا
جمشید کے کلام میں بھی اس جوش کی بہت عمدہ مثالیں موجود ہیں اور اس اعتبار سے وہ
ایسا فرزند سعادت مند ہے جس نے اس میراثِ پدر کو خاص طور پر اپنی غزل کے سینے
سے لگا رکھا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

تنہا ہر ایک رہ سے گذر جانا چاہئے
جیسے جئے ہیں ویسے ہی مرجانا چاہئے

جانے یہ دل کا درد کہاں تک ستائے گا
دریا چڑھے تو اسکو اُتر جانا چاہئے

بجھ کر وجود شعلہ سلگتا ہے کس لئے
میں راکھ ہوں تو مجھ کو بکھر جانا چاہئے

اے دوستو کھڑے ہو مرے گرد کس لئے
کوئی بتاؤ مجھ کو کدھر جانا چاہئے

جمشید سُن رہے ہو سفر کی پکار کیا
طوفاں کو یوں نہ رہ میں ٹھہر جانا چاہئے

خنجر تھا اگر میں تو مرے وار کہاں ہیں
میں وقت کے سینے میں اُتر کیوں نہیں جاتا

بیکار سی اُلجھن میں دل و جاں ہیں گرفتار
جو کچھ بھی گذرنا ہے گذر کیوں نہیں جاتا

وہ شخص تو اس حال میں جینے کا نہیں تھا
جمشید اگر تو ہے تو مر کیوں نہیں جاتا

دیکھ سکتا کسی خنجر کی لپک کا منظر
کوئی غم خوار قریبِ رگِ جاں ہو سکتا

چاند کی مشعلِ بیکار بجھا دی جاتی
رات پر رات کا شدّت سے گماں ہو سکتا

جمشید کی نظموں پر فیض صاحب کا اثر سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے اس کی نظموں کی فضاؤں میں جو شیلی لے ملائم اور کومل ہو گئی ہے۔ یادوں کے سبز مناظر اور دردِ جدائی اس کی نظموں کا مرکزی احساس ہے۔ نارسا' فرار' تنہا' اے غمِ دہر ذرا' اور تھکن اس احساس سے چُور چُور ہیں۔ یہ جدائی اور محرومی رومانی فرار عطا کر کے اسے خوابناک فضاؤں میں لے جاتی ہے۔ اس کی نظم ' منتظر ' اسکی بہت ہی

عمدہ مثال ہے۔

عکسِ محبوب مہکتا ہی چلا جاتا ہے
شمعِ رخسار لئے ، وعدۂ دیدار لئے
جنّتِ چشم و لب یار سے خورشید بکف
جاں کی تنہائی میں قندیلِ صبا اُترے گی
نور سے دکھ کے سیہ راستے دُھل جائیں گے
ریگزاروں کی جبینوں پہ گھٹا اُترے گی
ذہن سے روح کی ویران گذر گاہوں تک
نکہت و رنگ کے گلبار دریچے آخر
شوق کی دستکِ بے تاب سے کُھل جائیں گے
اسی امید میں شاید کوئی جھونکا آ جائے
اور چپکے سے کوئی درز کوئی چاک کُھلے
چاندنی دل کے کواڑوں سے لگی بیٹھی ہے

شعر کے بارے میں جمشید کا اپنا نقطہ نظر یہ ہے کہ روحِ معانی لفظ کی آنچ میں ایسی جل

کررہ جاتی ہے کہ صاحبِ سرود کو خود اپنا گیت سنائی نہیں دیتا۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ گلِ حرف کے وسیلے کے بغیر مفہوم کی خوشبو پھیلنے لگے۔

شعر بننے سے خیالات بکھر جاتے ہیں
کاش جمشید یہ دکھ یوں ہی بیاں ہو سکتا

اپنے اس نقطۂ نظر میں جمشید نے اظہار کے سلسلے میں عجزوانکسار کا پیرایۂ اختیار کیا ہے لیکن اس کے باوصف میں نے اس کی غزلوں، نظموں اور دیگر اصناف سخن میں زبان وبیان کا کسی قسم کا کوئی جھول محسوس نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس وہ بڑے نادر خیالوں کو لفظوں کی بڑی خوبصورت قبائیں پہناتا ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی نہاد شاعرانہ ہے اور اس کا تخیّل جمالیاتی شعور سے مالا مال ہے۔

اس مجموعے کے بعد عنقریب اس کا تیسرا مجموعہ شعر بھی منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اس کے اس مجموعے کو بھی میں نے جستہ جستہ دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس نے ایسی فنی لطافتوں تک رسائی حاصل کرلی ہے جو شعر کو سہلِ ممتنع کے درجے تک پہنچا دیتی ہے میں سہلِ ممتنع کی نصابی کتابی تعریف سے سخت الرجک ہوں۔ میرے ذہن میں اس اصطلاح کے معانی یہ ہیں کہ ایک خیال موزوں ترین پیکر کی تلاش میں مدتوں سرگرداں رہتا ہے۔ خیال کو ایسا پیرایہ میسّر آجائے تو یہی سہل ممتنع ہے۔ اور اب اس ضمن میں جمشید کے کچھ نوادرات ملاحظہ فرمایئے۔

میرا سینہ تو مرا سینہ ہے
مرا خنجر بھی مرا ہو جیسے

بس دور سے مجھے دیکھنے دو
اس میں بھی عجیب سا مزہ ہے

ہونٹوں سے وہ دیکھتا ہے مجھے
آنکھوں سے مجھے پکارتا ہے

لمحوں کے سمندروں میں جیسے
بہتا ہوا چاند آ رہا ہے

مجھ پہ نہ قیاسِ غم کر اپنا
ہر شخص کا حادثہ جدا ہے

کھوئے ہوئے لمحے کہیں آواز نہ دیں
گذرا ہوں بہت تیز تری رہ گذر سے

بُلا رہے ہیں غمِ زندگی کے ہنگامے
تمہاری یاد سے فرصت ملے تو چلتے ہیں

تم نے کیوں سوچ لیا درد مٹا دے گا ہمیں
ضبط کر لوں تو نہ آنسو نہ تمنّا نہ فراق

جمشید نے ایک انتہائی قابلِ ذکر کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ نارویجن شاعری کے منظوم ترجموں کا ایک مجموعہ بھی مرتّب کیا ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ اس خوبصورت ترجمے سے اردو شاعری نارویجن شاعری کی خوبصورت فضاؤں سے آشنا ہو کر بڑی دامن دار اور ثروتمند ہوئی ہے۔ جمشید کے ترجمے کے تیور دیکھئے۔

جب سورج دشمن ہو جائے دریا سے پناہیں مانگتے ہیں
دریا سے لڑائی ٹھہرے تو جنگل سے باہیں مانگتے ہیں

......

اس قیامت کے جو بپا نہ ہوئی
ہم بھی عینی گواہ ٹھہرے ہیں

......

وقت ایسے کمرے ہیں
جن میں عمر کرتے ہو
جن کو چھوڑ کر اکدن
بے قرار سمتوں میں
روز و شب بکھرتے ہو

وقت اک اٹیچی ہے
جس میں جو بھی رکھتے ہو
اسکو بھول جاتے ہو
یاد کے خزانے کا وقت اک بقایا ہے
وقت نے لکھا جس کو وقت نے مٹایا ہے

آج سے چند روز پہلے ایک محفل میں جناب ضیاء جالندھری نے بڑے پتے کی بات کی کہ ایک زمانے میں برطانیہ والے یہ تسلیم ہی نہیں کرتے تھے کہ ان سے بہتر بھی کوئی انگریزی لکھ سکتا ہے ۔ آخر کار انہیں امریکہ۔ آسٹریلیا ' دولتِ مشترکہ کے ممالک اور کئی دوسرے ملکوں کے انگریزی کے ادیبوں اور شاعروں کی عظمت کو سلام کرنا پڑا۔ اسی طرح اب یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا اُردو ادب صرف برصغیر پاک وہند تک محدود نہیں۔ اس میں سمندر پار کے ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا حصّہ کیف و کم کے اعتبار سے بہت ہی گرانقدر ہے اور اس دعوے پر جمشید مسرور کی شاعری تابناک گواہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں نے جمشید کے مجموعہِ کلام پر مضمون لکھنے کے لئے مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد کاغذ پر کچھ Points لکھے اور اس کے بعد اپنے دوست اور معروف ادیب و شاعر جناب پروفیسر احسان اکبر سے درخواست کہ اس مجموعے کے مطالعے کے بعد ایک کاغذ پر اپنے تاثرات قلمبند کردیجئے ۔ میری حیرت کی کوئی انتہانہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے Points اور احسان صاحب کے Points میں صرف یہ فرق تھا کہ دو مختلف ہاتھوں

کے لکھے ہوئے تھے۔ ہمارے تاثّرات میں ایک نقطہ یہ بھی تھا کہ جمشید مسرور خدا کا ذکر کرتے ہوئے کچھ تلخ تلخ بولنے لگتا ہے۔ اس سلسلے میں جمشید مسرور سے مخاطب ہو کر میں صرف اتنا عرض کروں گا ـــــ کہ اے مرے بھائی! کبھی فرصت ملے تو موسیٰ و خضر کا قصّہ بدقّت پڑھ ـــ تیری شکایت آلودبے صبری نے جو سوالات پیدا کئے ہیں اس حکایت میں ان سب کا تسلّی بخش جواب موجود ہے ـــــ دیکھ! تجھ پر اللہ نے کتنے کرم کئے ہیں۔! دنیا کی کونسی نعمت تجھے میسّر نہیں ہے؟ خدا نے پردیس کو ترے لئے Paradise بنادیا ہے۔ وہاں پر بھی تیری شاعری کو قبولِ خاطر حاصل ہے اور یہاں بھی اس کے چرچے ہو رہے ہیں۔ تیرے چاہنے والے دوست تجھے وہاں بھی میسّر ہیں اور یہاں بھی۔ اللہ نے تجھے صحت وسلامتی سے نوازا ہے اس نے تجھے خیالوں کی کتنی خوشبوؤں سے مالامال کیا ہے۔ شعروں کے کتنے خوبصورت پھول اس نے تجھے بخشے ہیں ـــــ رب کا شکر ادا کر بھائی!

گفتنی ناگفتنی

میں ایک بس میں بیٹھا ہوا شمیم حیدر کی کتاب 'گفتنی ناگفتنی' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دائیں طرف سے اچانک ایک قہقہہ بلند ہوا اور یہ جملہ بھی کہ "بہت دلچسپ ہے"۔ میرے ایک ہم سفر اس کتاب میں میرے شریک مطالعہ ہو چکے تھے۔ میں نے کتاب سے نظر اٹھا کر ان سے دریافت کیا "آپ کیا کام کرتے ہیں؟" کہنے لگے ہمارا پریس ہے۔ اسکے بعد میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا اور دل پر ایک رعب سا طاری ہوگیا کہ پریس والے جس شخص کے اتنے معترف ہوں اسکے لطفِ کلام میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

یہی کتاب جب میرے ایک ہمکار اور پروفیسر دوست نے میرے ہاتھ میں دیکھی

اور اسکے ٹائیٹل کا جائزہ لیا تو مجھ سے کہنے لگے۔"انور مسعود،تم اس کتاب پر مضمون لکھو گے؟" مَیں نے کہاکہ جی ہاں ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ کہنے لگے اب تم خود ہی سوچو کہ ایک ایسا شخص جسکی تعلیم بالکل واجبی ہے' پیشہ جس کا منشی گیری ہے۔ فنون لطیفہ تو ایک طرف اپنی اہلیہ کو سمجھنے کی اہلیّت سے بھی عاری ہے اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ کوئی نیا گُل کھلانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ ایسے کمپارٹمنٹ کے کیس پر آخر تم لکھو گے کیا؟

مَیں نے کتاب کے اندر جھانکا تو معلوم ہوا کہ ٹائیٹل پر مصنّف کا تعارف کافی انکسار آلود ہے مگر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ شمیم حیدر خاصا پڑھا لکھا شخص ہے اور فنون لطیفہ میں شاعری کے ساتھ تو اسے ایسا علاقہ ہے کہ سطر سطر میں مصرعے یوں گُندھے ہُوئے ہیں جس طرح چوٹی میں پھول اور فارسی کے حسنِ ذوق کی شمیمِ جاں فزا 'گفتنی ناگفتنی' کے ورق ورق میں موجود ہے اور اُردو کے اشعار اور ضرب الامثال اور محاورات تو اتنی مقدار میں ہیں کہ کوئی آڈٹ والا ہی انکی صحیح تعداد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

اس شخص کے علم و فضل سے انکار کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے جو پبلک سروس کمیشن کی طرف سے اعلیٰ ملازمتوں کے امیدواروں کے لیے ایک نہیں بلکہ تمام مضامین کے پرچے بناتا ہے۔ جس کا دائرہ معلومات ادبیات' معاشیات' سماجیات' سیاسیات' نفسیات اور ازدواجیات تک پھیلا ہوا ہے۔

وہ سیاسیات کے پرچے میں یہ سوال set کرتا ہے کہ اس بات پر تبصرہ کیجئے کہ "آمروں کی زندگی شیر پر سواری کی طرح گذرتی ہے وہ شیر سے اُتر نہیں سکتے کیونکہ شیر بھوکا ہوتا ہے"

اردو ادب کے پرچے میں وہ یہ پوچھتا ہے کہ "گلشن کون تھی اوراس کا کاروبار

کیوں نہیں چلتا تھا" اس کے علاوہ وہ اس موضوع پر بھی تبصرہ طلب ہے کہ ' نثری نظم بغیر net کے ٹینس کھیلنے کی طرح ہے۔' اس پرچے میں وہ یہ بھی پوچھتا ہے کہ آیا علّامہ اقبال نے خدا کے حضور میں یہ سوال خاندانی منصوبہ بندی والوں کے 'اکسانے پر کیا تھا؟۔

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

نفسیات کے پرچے میں وہ ایک ایسا سوال پوچھتا ہے جو میرا جی چاہتا ہے کہ اس سے پوچھوں۔ "آپ پڑھے لکھے نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟"

مصنّف کے تبحرِ علمی کے باب میں ازدواجیات کا حوالہ آچکا ہے۔شمیم حیدر نے کتاب کا انتساب اپنے بچوں کی ماں کے نام کیا ہے اور پھر ہُوا یوں ہے کہ یہ انتساب ساری کتاب پر چھا گیا ہے ۔شاید ایک مضمون ہے جو BEGUMLESS ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون رواروی میں تجدیدِ نظر کے بغیر کاتب کو تھما دیا گیا ہے۔یقین کیجئے کہ بیگم کا تذکرہ امتحانی سوالات میں بھی در آیا ہے سوال ملاحظہ فرمایئے ' اگر اس امتحان کے نتیجے کے طور پر آپکی بیگم آپ سے بہتر عہدہ پر فائز ہو جائیں اور آپ دفتری دنیا میں بھی ان کے ماتحت لگ جائیں تو ان سے آپ کے دفتری تعلّقات کی نوعیت کیا ہوگی؟' کتاب کے مطالعے کے دوران میں یہ خیال کئی بار آیا ہے کہ بھلے آدمی ــ

اچھا ہے تیرے ساتھ رہے تیری اہلیہ
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کتاب میں مذکور جس واقعہ کو پڑھ کر میرے بس کے ہم سفر نے بے ساختہ قہقہہ

لگایا تھا وہ واقعہ بھی شنیدنی ہے۔

''ایک صاحب ملاقاتیوں سے ازحد گریزاں تھے۔چپراسی کو ہدایت دے رکھی تھی کہ ملاقاتی کتنا ہی بضد ہو دفتر میں داخلہ بند ہے۔راندگانِ دربار بہانے بناتے۔کوئی کہتا کہ مَیں صاحب کا دوست ہوں۔جواب ملتا سبھی ایسا کہتے ہیں۔کوئی مجبور یہ کہتا کہ بہت ضروری کام ہے۔ حکم ہوتا سبھی ایسا کہتے ہیں۔کوئی دوسرا کہتا کہ صاحب نے خود بلایا ہے۔جواب ملتا سب ایسا ہی کہتے ہیں۔شومیِ قسمت سے ایک دن خود صاحب کی بیگم ملاقات کے لیے آگئیں۔دربان آڑے آیا۔کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ملی۔کہنے لگیں مَیں صاحب کی بیگم ہوں۔ردِّ عمل ہوا کہ سبھی ایسا کہتی ہیں۔گھر پہنچ کر بے چارے صاحب کے ساتھ جو سلوک ہوا کچھ نہ پوچھئے۔ شنیدہ کَے بود مانندِ دیدہ۔''

ایک مضمون میں مصنّف نے اپنی خوفزدگی کے ماخذ کو یوں بیان کیا ہے

''ویسے بھی ہمیں اللہ تعالیٰ اور اپنی بیوی کے بعد صرف پولیس سے ڈر لگتا ہے۔''

شمیم صاحب کے بیان کردہ بیگمی اور بیگماتی تذکرے پڑھ کر قاری کے دل میں ان سے ہمدردی کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے اسلئے کہ بقول مشتاق یوسفی انسان خطا اور نِسوان کا پتلا ہے''

کسی ادبی کتاب کے بارے میں بالعموم صرف دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ اس میں کیا کہا گیا ہے اور کس طرح کہا گیا ہے؟ پہلا سوال موضوع کے بارے میں ہے اور دوسرے کا تعلق فن سے ہے۔ شمیم حیدر کے فکاہیہ مضامین میں موضوعات کا بڑا تنوّع دکھائی دیتا ہے۔ ان موضوعات میں نہانا بھی ہے۔مکان کا بنانا بھی ہے۔کھڑا کھانا بھی ہے۔عید کا مِلنا ملانا بھی ہے اور ریٹائر ہوجانا بھی ہے۔ بعض مضامین میں ایسے معاشرتی دُکھوں کا تذکرہ بھی ہے جنہیں پڑھ کر یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ ـــ کچھ علاج ان کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں ـــ سیلِ زماں کے سامنے انسان کی مجبوریوں کے

بارے میں شگفتگی میں لپٹی ہوئی ایک دبی دبی سی شکایت کی لے بھی سنائی دیتی ہے۔

چپراسی پر ان کا مضمون پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنی جگہ کتنی اہمیت رکھتا ہے ۔۔۔ سایہ لالہ بیداغ سویدائے بہار ۔۔۔ جس طرح پنواڑی سگرٹ کی خالی ڈبیوں کے محل سجاتا ہے' چپراسی کے نہالِ غم کی شاخ پر بھی خواہشوں کے کئی پھول کھلنا چاہتے ہیں۔ چپراسی کے اس جملے میں کیا کچھ نہیں ہے۔ کہ " میں آج دورے پر جارہا ہوں اور صاحب بھی ساتھ ہے"

نئے تمدّن کی زد میں آکر متروک ہوجانے والے محاوروں کی بحث میں شمیم حیدر دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زبان کوئی تالاب کا پانی نہیں ہے جو ایک جگہ ٹھہر جائے۔ یہ تو پہاڑ کی ندی ہے جو ہر دم رواں دواں ہے' ضروری تبدیلیوں کو قبول کرتے رہنے سے ہی کوئی زبان زندہ رہتی ہے۔

شمیم حیدر کا اسلوب بیان دلچسپ واقعات' معیاری لطائف' اُردو اور فارسی کے خوبصورت اشعار اور اَمثال و حِکَم کی پیوند کاری سے ترکیب پاتاہے — **حدیث** دلکش وافسانہ از افسانہ می خیزد — رعایتِ لفظی انکے مزاح کا ایک اہم حربہ ہے۔اس ضمن میں ان کا مضمون ' کارِادب' ایک نمائندہ مضمون ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ' کارِ ادب' کا عنوان ایک مقناطیس ہے اور پھر جس لفظ کے ساتھ کار کا لاحقہ یا سابقہ آگیا ہے وہ اس مقناطیس سے لوہ ِ چُون کے طرح چمٹتا چلا گیا ہے ۔۔۔ ایک دو مقامات پر مصنّف کے قلم سے کچھ ایسی شوخی کا اظہار بھی ہُوا ہے کہ — کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں۔

اس مقام پر صرف اتنا عرض کروں گا کہ حدود کا مسئلہ شریعت میں بھی ہے اور ادب میں بھی۔ حضورِ یار میں یہ ایک بات اپنی جگہ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شمیم صاحب کے کئی ایک جملے اتنے خوبصورت ،شگفتہ اور فکر انگیز ہیں کہ جن کی داد دیئے

بغیر نہیں رہا جا سکتا۔مثال کے طور پر آڈٹ والوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔" فائلوں کے ڈھیر تواس محکمے میں یاجوج ماجوج کی دیواریں ہیں کہ بناتے رہو اور چاٹتے رہو۔"

اسلام آباد کے مضمون میں رقم طراز ہیں۔"اک دوست ہمارے یہاں پر گریو یارڈ (GRAVE YARD) آفیسر ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔"

اپنے مضمون 'جھوٹ کے پاؤں' میں لکھتے ہیں۔"جھوٹ اور سچ کی کیفیت انسانی زندگی میں ایک ربڑ والی پنسل کی طرح ہے جس میں جھوٹ ربڑ ہے۔ اگر یہ ربڑ پنسل سے پہلے ختم ہوجائے تو آپ یقیناً حد سے گذر رہے ہیں۔"

پنجاہ سال عمرِ عزیزت گذشت' میں ایک بہت عمدہ نکتہ بیان ہوا ہے کہ یہ عمر بہت سی چیزوں سے اجتناب کا دور ہوتا ہے۔کچھ سے ڈاکٹر روکتے ہیں کچھ سے زوجہ اور کچھ سے بچے۔ گویا زندگی نہیں زندگی کی پیروڈی رہ جاتی ہے"

ایک جگہ لکھتے ہیں: " لوگ سیاستدانوں کے خلاف کیوں ہیں وہ تو کچھ بھی نہیں کرتے۔"

مکان بنانے کے ضمن میں انکے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ"خواتین کی ایک قسم ریموٹ کنٹرول سے تعمیر مکان کی ماہر ہوتی ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ 'گفتنی ناگفتنی' اردو کے فکاہیہ ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ مصنف نے اپنے تلخ تجربات کو بھی بڑے شگفتہ انداز میں دُہرایا ہے۔ مَیں ایک فارسی کا طالبعلم ہوں اس اعتبار سے مجھے اس کتاب میں فارسی کی مہک بہت بھلی معلوم ہُوئی ہے۔ کتاب میں مزاح کی چاشنی کے پیشِ نظر میرا قلم مجھے کہتا ہے کہ ــــ شمیم حیدر کو بھی منجملہ قبیلہ سیّد ضمیر لکھ ــــ فارسی کی بات سے یاد آیا کہ عرفی جب ایران سے اس برصغیر کی طرف آرہا تھا تو بحری سفر کے دوران اس کادیوان سمندر میں ڈوب گیا۔ اپنی اس متاعِ ہُنر کی غرقابی کے حادثے پر اس نے ایک لازوال شعر کہا:

گفتہ گر شُد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست
از دوصد گنج یکے مشتِ گہر باختہ ام

یعنی میرے کہے ہوئے اشعار اگر ضائع ہوگئے ہیں تو کوئی بات نہیں، مقامِ شکر ہے کہ وہ سارے شعر میرے پاس ہیں جو میں نے ابھی نہیں کہے۔ ابھی تو سیکڑوں خزانوں میں سے مَیں نے موتیوں کی صرف ایک مٹھی لٹائی ہے۔

خوفِ فسادِ خلق سے شمیم حیدر صاحب کا ڈھیر سارا ناگفتہ ابھی باقی ہے۔ انکی اس شگفتگی کے سب منتظر ہیں۔

عذرا وقار کا تجزیہ وارث

وارث شاہ کی عظمت کو صاحبِ سیف الملوک میاں محمّد بخش صاحب نے ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

وارث شاہ سخن دا وارث نندے کون انہاں نوں
حرف انہاں تے اُنگل رکھنی نہیں مجال اساں نوں

یعنی وارث شاہ وارثِ سخن ہے۔ کون ہے جو اسکے بارے میں ہلکی رائے کا اظہار کرے ہمیں یہ مجال نہیں ہے کہ اسکے کسی حرف پر اُنگلی رکھ سکیں-وارث شاہ کی سخنوری کے بارے میں میاں صاحب کی یہ رائے اتنی وقیع ہے کہ اس سے بھی اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے-وارث شاہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے مثال دیدہ ور بھی ہے-اسے احساس اور تجزیے کی ایسی صلاحیت ارزانی ہوئی ہے کہ اسکے کلام میں اسکے زمان و مکان کی ساری دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور اسکے

بیان کردہ قصے میں پنجاب کی روح سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔اسکے قصّے کو وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو وہ انسان کے باطن اور معاشرتی سطح پر برپا رہنے والی پیکارِ خیر وشر کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔اسکے یہاں شعورِ خویشتن بھی ہے 'شعورِ دیگراں بھی' اور شعورِ ذاتِ حق بھی اسلئے وارث شاہ اور اسکی ہیر پنجابی ادب میں مطالعے کا اہم ترین موضوع قرار پاتے ہیں۔اس سلسلے میں سنجیدہ کوششوں کا آغاز ہو چکا ہے۔عذرا وقار کی تصنیف 'وارث شاہ ۔ عہد اور شاعری' اس ضمن میں تحقیق اور تنقید کا ایسا نمونہ ہے جسے وارث شناسی کے سلسلے میں ایک قابلِ تحسین پیش رفت کہا جاسکتا ہے۔ عذرا وقار نے وارث شاہ 'اسکی شاعری اور اسکے معاشرے کی مثلّث کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا ہے۔اسکی اس کاوش کے پیچھے یہ جذبہ بڑی شدّت سے کارفرما ہے کہ اپنے ہاں کے پڑھے لکھے مغرب زدہ طبقے کو اپنے ادب کی رفعتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ عذرا کا اُسلوبِ بیان متین ہونے کے باوصف نہایت عام فہم اور خوشگوار ہے۔ عام طور پر تنقیدی اور تحقیقی تحریریں ایسی خشک اور گنجلک ہوتی ہیں کہ قاری کے ذہن پر بے اندازہ تھکن لاد دیتی ہیں۔ اسکے برعکس عذرا کی تحریر میں ایک شگفتہ سی خیال انگیزی کی لہر موجود رہتی ہے جو قاری کو کتاب کے کسی ورق پر شکن ڈالنے کا موقع نہیں دیتی۔

کسی نقّاد اور محقّق کا بے طرف ہونا اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادبی نقّادوں نے ایسے ایسے تعصّب کا اظہار کیا ہے کہ ناطقہ سربگریباں ہے۔۔۔بے رنگ شیشے سے رنگِ دنیا دیکھنا بڑا دشوار ہے۔ عذرا وقار نے اس ضمن میں بڑی احتیاط کا ثبوت دیا ہے کہ کسی خاص رنگِ تنقید کو اس نے اپنے اوپر مسلّط نہیں ہونے دیا۔کتاب کے تعارف میں اس نے بہت صحیح کہا ہے :۔

"یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس نقطۂ نظر سے بھی کسی ادب پارے کو پرکھا جائے اس کا جواز ادب پارے میں موجود ہو۔" عذرا نے حتی الامکان اس اصول کی پابندی کی ہے اور اس مطالعے کے دوران میں اس نے وہی اصولِ تنقید استعمال کئے ہیں

صورتحال جن کا تقاضا کرتی تھی۔موقع بہ موقع جدید تنقیدی اسالیب بھی استعمال کئے ہیں اور علم معانی و بیان سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں وارث کے عہد یعنی اٹھارہویں صدی کے پنجاب کے معاشی 'سیاسی 'جغرافیائی اور ثقافتی حالات تاریخی اسناد و شواہد کے ساتھ بھرپور طریقے سے بیان کئے گئے ہیں اور سیاسی اور معاشرتی سطح پر ہندومت اوراسلام کے امتزاج کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں کی تفصیلاً" نشاندہی کی گئی ہے ۔اس ضمن میں اکبر کا دین الہٰی 'بھگتی تحریک 'سکھ مذہب اور تصوّف کے مختلف سلسلے بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ شاعری میں اس امتزاج کا ذکر کرتے ہوئے عذرا وقار لکھتی ہیں :۔

"امیر خسرو' شاہ حسین اور بُلھے شاہ نے ہندوستان میں اسلام اور ہندو مت کے افکار کو ملانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔"

آگے چل کر مصنّفہ نے یہ واضح کیا ہے کہ وارث کی شاعری نے اسی رلی جُلی ثقافت میں جنم لیا اور اسکے اثرات اسکے کلام میں صاف دکھائی دیتے ہیں ۔اس بحث میں مصنّفہ نے یہ نتیجہ اخذ کیاہے:۔

" اگرچہ وارث شاہ بنیادی طور پر اسلامی ذہن رکھتے تھے تاہم انکے افکار پر ہندو فکر کا اثر بھی نظر آتا ہے۔"

اس باب میں وارث کے عہد کی تجارت 'صنعت و حرفت ' منصب داری نظام' تعلیمی حالت' اندرونی اختلافات' بیرونی حملے اور مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے استحصالی معاشرے کی زندگی کے سارے پہلو اسطرح دکھائے گئے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے پنجاب کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ وارث شاہ کی ہیر میں معاشرتی ادارے جو کردار ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تاریخی تحقیق اس کی ہو بہو تائید کرتی ہے۔عذرا وقار نے اس دور کے احوال و کوائف کی جمع آوری میں خاصی تحقیقی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔

دوسرے باب میں عذرا وقار نے شعری روایت میں وارث شاہ کے مقام کا تعیّن کیا ہے :-

" وارث شاہ کی شاعری پنجابی عوام کے دلوں سے پھوٹتی ہے۔ یہ ایک لحاظ سے عوامی شاعری ہے کہ یہ انہیں ایک مرکز پر لا کھڑا کرتی ہے اور انکے اپنے جذبات اور تجربات کا نچوڑ ہے"۔

اس ضمن میں عذرا کی یہ بات بڑی وزنی ہے کہ اچھا شاعر اپنے ذہنی تجربے کی آمیزش سے لوک ادب کے استعارات کو فنکارانہ انداز میں استعمال کرتا ہے اور اس سے شاعری میں ذومعنویت پیدا ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ساتھ عذرا نے پنجاب کی لوک کہانیوں اور انکے کرداروں کا یہاں کے زرعی معاشرے بالخصوص مادر سری نظام کے پس منظر میں تجزیہ کیا ہے اور ان کہانیوں کی رمزیاتی اہمیت کی نشاندہی کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رومانی قصّوں میں مختلف کرداروں کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف روّیوں کو تمثیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ تجزیہ نہایت خیال انگیز ہے اور اسکے ساتھ ہی پنجابی شاعری کی مختلف اصناف کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اسکے بعد ہیر کے قصے کو وارث سے پہلے منظوم کرنے والے شعرا (دمودر،احمد گوجر اور مقبل) کے احوال زندگی اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے اور وارث کی ہیر سے ان کا موازنہ کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وارث پر سب سے زیادہ اثر احمد کوی کا ہے اور پھر یہ تحقیق بھی کی ہے کہ ہیر اور رانجھے کے استعارے شاہ حسین، بلھے شاہ، علی حیدر، بچل سرمست اور خواجہ فرید کی شاعری میں کس معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ عذرا وقار کی اس بات کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وارث کی شاعری کی دو سطحیں ہیں۔ یہ معاشرتی شاعری بھی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ تصّوف کی روایت سے رابطہ رکھتے ہوئے عارفانہ معنویت کی حامل بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ وارث کی اپیل کا دائرہ بہت وسیع ہے او اسکے آہنگِ شعر پر ایک دنیادار بھی جھوم اٹھتا ہے اور ایک صوفیِ باصفا بھی۔

تیسرا باب وارث کی سخن ورانہ ہنرمندیوں سے متعلّق ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پنجابی شاعری کی پوری روایت وارث کے ذہن میں موجود ہے۔ اس کا تخیّل بے انتہا توانائی کا حامل ہے اور اسکی فنکارانہ نظر نہایت گہری ہے اور ہرشے کے ظاہر و باطن کو پرکھ سکتی ہے۔ علومِ متداولہ ' موسیقی اور تصوّف سے اسکو زبردست آگاہی حاصل ہے اور اس کا تاریخی شعور انتہائی توانا ہے۔ وارث کے شاعرانہ کمالات پر تبصرہ کرتے ہوئے عذرا لکھتی ہیں :۔

"انھوں نے انسانی زندگی کی بنیادی صداقتوں کو شاعرانہ حقائق بنا کر علامتوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ انکی شاعری میں ہمیں زندگی کے تہہ در تہہ اسرار ' اسکے آلام وانبساط 'عشق 'خدا 'کائنات' جبرو فنااور انسان کی بے پناہ باطنی قوت کے ساتھ ساتھ اسکی کمزوریوں اور مجبوریوں کا علم بھی ہوتا ہے۔"

اسکے بعد عذرا نے عظیم شاعری کے ان دائمی عناصر کا سراغ لگایا ہے جو وارث کے کلام میں کار فرما ہیں۔ وہ اس لئے ایک عظیم شاعر ہے کہ اپنے ماحول اور ماضی سے اس کا گہرا رابطہ ہے۔ علاقائی استعارات 'تشبیہات اور تاریخی حوالے اسکی شاعری میں جذب ہوگئے ہیں۔ ہیر میں ایک مکمّل اور مثالی کہانی کی تمام خصوصیّات موجود ہیں اور ڈرامے کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ وارث شاہ نے لفظوں کواسطرح استعمال کیا ہے کہ وہ اپنے جملہ فکری تلازمات کی زبان بن گئے ہیں ۔اسکے شعر کی موسیقی دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہے اور اس نے اپنے کلام میں جمالیاتی ذوق کی تسکین کے سارے قرینے فراہم کر دیئے ہیں۔ اس باب میں عذرا وقار کا تجزیہ یہ ہے کہ وارث شاہ کی شاعری خود وارث کے قول کے مطابق تمثیل کی شاعری ہے۔ ہیر وارث شاہ میں تشبیہوں ' استعاروں اور علامتوں کا جوایک جال سا بچھا ہوا ہے عذرا وقار نے مثالیں دیکر اسکی تمثیلی حیثیت کی بھرپور وضاحت کی ہے اور اسکے ساتھ ساتھ نہایت برمحل شواہد کے ساتھ وارث کی منظر نگاری 'ماحول کی عکاّسی اور انسانی جذبات کے ساتھ اسکی نفسیاتی تطبیق کو اسطرح اجاگر کیا ہے کہ وارث کے حسنِ کلام

کی معنوی توسیع سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پنجاب کی صبح ہو یا ہیر کا حسن وارث کی جزئیات نگاری ہر جگہ لا جواب ہے۔

پنجابی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ایک ایسا موضوع ہے جو ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے۔ پنجابی ادب کے تذکرے اور ادبی تاریخیں بھی اس سلسلے میں کوئی خاص رہنمائی نہیں کرتیں ۔اس موضوع کی تحقیق کا نقطۂ آغاز بھی ہمارے کلاسیکی شعرا کا کلام ہونا چاہیے۔ شاید یہ کام اس لئے معرضِ التوا میں رہا ہے کہ یہ تلاش بڑی جانکاہی کی متقاضی ہے۔ یہ بات بڑی خوش آیند ہے اور عذرا وقار اس سلسلے میں بجا طور پر داد کی مستحق ہے کہ اس نے وارث کی شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر کی نشاندہی کر کے پنجابی شاعری کے اس پہلو پر کام کرنے والوں کے لیے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی ہے۔ وارث کے مزاح کے بارے میں عذرا کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے :۔

" وارث شاہ کی شاعری کا مزاح انسانی زندگی کے کرب کو کم کر دیتا ہےاور ہمارے تمام افسردہ جذبات کی تطہیرہوجاتی ہے۔"

اس موضوع کے ضمن میں یہ بحث بھی در آئی ہے کہ وارث حقیقت نگاری اور فحش گوئی کی حدود سے کاملا" آگاہی رکھتا ہے۔ ایسے مقامات وارث کے ہاں ایک مزاحیہ موڑکی حیثیت رکھتے ہیں جو اس دور کی معاشرت کی عکاّسی کرتے ہیں اور ان میں کہیں بھی لذّتیّت کا شائبہ نہیں ہے۔

عذرا وقار نے بڑی جاندار مثالوں سے واضح کیا ہے کہ وارث شاہ ایک قصّہ گوہی نہیں بلکہ ایک کامیاب تمثیل نگار بھی ہے۔ اس نے بڑے زور دار مکالموں اور کرداروں کے تضاد اور تصادم سے قصے کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ تضاد کرداروں کے اندر بھی برپا ہے اور باہر بھی اور اسطرح یہ کہانی ڈرامے کے حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ اسی لئے اسکو نقل اور کھیل کی حیثیت سے بھی پیش کیا جاتا رہا ہے ۔وارث نے اپنے مکالموں میں صورتحال کی مناسبت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اسی لئے ان مکالموں میں بلا کی اثر آفرینی پیدا ہو گئی ہے۔عذرا نے وارث کے فن پر بحث کرتے ہوئے

اسکی تاریخی، روایتی اور ادبی تلمیحات کا بھی اس انداز سے جائزہ لیا ہے جس سے وارث کی ترسیلِ معانی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس ضمن میں عذرا نے ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور وہ ہے وارث کے **مقطعے**۔ جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ وارث نے اپنے **مقطعوں** کی مدد سے کہانی میں ربطہ پیدا کرنے اور اسے آگے بڑھانے کا کام لیا ہے اور ان مقطعوں سے خود وارث شاہ کی شخصیت کے کئی پہلو سامنے آگئے ہیں۔عذرا نے اس موضوع پر بہت مختصر اظہار خیال کیا ہے حالانکہ یہ موضوع کچھ تفصیل طلب تھا۔میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر وارث شاہ کی ہیر ایک رفیع الشان ایوان ہے تو اسکے **مقطعے** اس ایوان کے پر شکوہ ستون ہیں۔ایسے ستون جن کے اندر سے وارث شاہ کا ہمہ گیر تجربہ بولتا ہے۔ یہ **مقطعے** دانائی کی ایسی گٹھڑیاں ہیں جن میں اَبَدی سچّائیاں لپیٹی ہوئی ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی اور موضوع کے لحاظ سے بھی یہ **مقطعے** وارث کے نوادراتِ فن ہیں۔ مثال کے طور پر وارث شاہ نے ایک مقام پر یہ بیان کیا ہے کہ زندگی کا تجربہ ہمہ جہت اور جامع ہونا چاہیئے۔ اب اس مضمون کے حسن کو اسکے **مقطعے** کے فریم میں ملاحظہ فرمائیے۔

وارث شاہ میاں گنّا چوپ سا رامزے دکھ نی پوریاں پوریاں دے

عذرا وقار نے وارث کے نظریہِ عشق پر بھی بڑی وقیع رائے کا اظہار کیا ہے کہ وارث کا تصورِ عشق بڑا دامن دار ہے اور زندگی کی مجازی سطح سے لیکر پیمانِ الست تک پھیلا ہوا ہے۔ عذرا نے ہیر کے مرکزی کردار رانجھے کے حوالے سے ہیر کے ایک المیہ ہونے کو انتہائی دلکش پیرائے میں اسطرح بیان کیا ہے :۔

”دنیائے ادب میں جو ہیر و بھی کائنات میں فرد کا مقام تلاش کرنے نکلا وہ المیہ کا شکار ہوا۔“

چوتھے باب میں عذرا وقار نے وارث شاہ کی زبان پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ یہ باب پنجابی زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات اُس کے ارتقائی سفر، اسکی

نغمگی، اسکی نشوونما میں صوفی شعرا کا حصہ اور وارث کے عہد میں پنجابی کی مختلف بولیوں اور انکے امتیازی لہجوں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ عذرا کا تجزیہ ہے کہ وارث کی زبان میں پنجابی کی تمام بولیوں کے رنگ پائے جاتے ہیں اور چوکھا رنگ پنجاب کی باروں کی بولیوں کا ہے اور اس سے عذرا نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ وارث شاہ غالباً انہی باروں کے علاقے میں زیادہ تر گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ اس بحث میں وارث کی لفظ شناسی پر بھی اسکے کلام کے شواہد کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ عذرا کے نزدیک وارث اس موثّر ترین اور لطیف ترین توانائی کے استعمال میں بے مثال مہارت رکھتا ہے جسے لفظ کہا جاتا ہے۔ وہ لفظوں کی جملہ قیمتوں سے آگاہ ہے۔ ہر لفظ کی موسیقیت ،معنویت اور تصویریت اس پر آشکار ہے اور اس کا محل استعمال جانتا ہے۔ لفظوں کے جملہ تلازمات اسکی نظر میں ہیں۔ اسکے لفظوں کے دریچوں سے جھانکئے تو اسکے عہد کے جاگیردارانہ ماحول کا پورا نقشہ دکھائی دینے لگتا ہے۔لفظ کے استعمال میں وارث کی ہنر مندی کے بارے میں عذرا وقار کا ایک اقتباس نہایت ہی قابل مطالعہ ہے:۔

" وارث شاہ الفاظ کے استعمال اور چناؤ میں فن کی انتہائی بلندی پر ہیں۔ یہ الفاظ انکی شاعری میں یوں استعمال ہوئے ہیں کہ ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سب الفاظ ایک رواں اور متحرک سُر کی ڈوری میں پروئے ہوئے ہیں۔ان میں سے کسی ایک لفظ کو چھیڑیئے تو سب کے سب الفاظ ڈھیر ہوجاتے ہیں"

اگرچہ عذرا وقار کی ساری تحقیقی کاوش تحسین طلب ہے لیکن میرے خیال میں اس کتاب کا سب سے معرکہ آرا باب وہ ہے جو وارث کی کردار نگاری سے متعلق ہے۔ اس باب کے آغاز میں مصنفّہ نے کردار نگاری کے فن پر بڑی جاندار اور نکتہ آفریں بحث کی ہے اور ایک مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ وارث کے کردار نہایت ذمہ دارانہ زندگی بسر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں حرکت اور فعالیّت کا عنصر غالب ہے۔ ہیر اور رانجھا اپنے معاشرے کی فرسودہ روایات اور غلامی کے

خلاف بغاوت کی علامت ہیں۔ اسکے بعد مصنّفہ نے ایک ایک کردار کی علامتی اور تمثیلی حیثیت واضح کی ہے اوران کرداروں کا نفسیاتی جائزہ بھی لیا ہے۔ اس سلسلے میں رانجھے کے حوالے سے وارث شاہ کی اپنی نفسیات سے بھی پردے اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

وارث شاہ نے خود یہ صراحت کردی ہے کہ ہیر محض ایک رومانی قصہ نہیں بلکہ ایک تمثیل ہے۔ اس اعتبار سے وارث نے عطاؔر کی منطقُ الطّیر اور رومی کی مثنوی معنوی کی تمثیل نگاری کے اسلوب کو اپنا کرپنجاب کے تہذیبی پس منظر میں ایک شاہکار مثنوی تخلیق کی ہے۔

وارث کو محض ایک قصّہ ہی بیان کرنا ہوتا تو یہ قصّہ تواس سے پہلے بھی بیان ہوچکا تھا اس لئے اس کا یہ دعویٰ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے تلاشِ حقیقت کے سفر کو ایک رومانی اور مجازی پیرائے میں بیان کیاہے۔ عذرا نے وارث شاہ کی رمزوں اور علامتوں کو سمجھنے میں بڑی دِقّت مطالعہ کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اور ایک ایک کردار اور واقعے کی علامتی حیثیت کو نہایت سلیس اور مربوط انداز میں سمجھایا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ ہر کردار کی روح میں اتر گئی ہے۔ وارث شاہ نے جو بات نہایت اجمال سے کہی ہے عذرا نے اسکی تفصیلات دریافت کرنے میں انتھک محنت کی ہے۔ رانجھا ہیر کا مرکزی کردار ہے اور ساری کہانی اس کے گرد گھومتی ہے ۔عذرا نے اس استعارے کی جو تشریح کی ہے اس کا مختصر ساتذکرہ نامناسب نہیں ہوگا۔

عذرا کے نزدیک رانجھے کا اختیار کردہ سفرانسانی خودشناسی کا سفرہے۔اس کا زادِراہ اسکی ونجھلی ہے جو اس کی باطنی قوّت کا استعارہ ہے۔ وہ خود سے بھی برسرِپیکار ہے اور غیرِ خود سے بھی۔ ہیر کا حسن ان اقدارِ حیات سے عبارت ہے رانجھا جنکی تلاش میں نکلا ہے۔ اس کٹھن سفرمیں اسے سارے رشتوں کی پہچان حاصل ہو گئی ہے۔ اور اس کا دل صیقل ہوکر ایک کسوٹی بن گیاہے جو کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرسکتا ہے۔ لیکن اپنی ذات کی طرف اس کا زیادہ جھکاؤ اسکی کمزوری ہے جو اسے

ناکامی سے دو چار کرتی ہے۔ بالناتھ وہ رہنما ہے جو رانجھے کی روحانی بالیدگی میں پڑی ہوئی یہ گرہ کھولتا ہے اور اسے اس کمال کے درجے پر پہنچاتا ہے جو پہلے اسے حاصل نہیں تھا۔ رانجھا جس وقت اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی زندگی سے خاموشی کے ساتھ نکل جاتا ہے اور دریا کو پار کر کے ہیر کے دیس پہنچتا ہے اس عبورِ دریا کی علامت کی شرح عذرا وقار کے الفاظ میں اسطرح بیان ہوئی ہے۔

"دریا پار کرنا رانجھے کی زندگی کا اہم ترین سنگِ میل ہے۔ ادب میں دریا پار کرنا استعارۃً دو مکاتیبِ فکر، دو قسم کی زندگی، دو تہذیبوں اور ذہنوں کے درمیان حد فاصل عبور کرنا ہے۔ رانجھا سچّائی کی تلاش میں اپنا تمام معاشرتی ماضی ایک کنارے پر چھوڑ آتا ہے۔ اس کا مستقبل دوسرے کنارے پر ہے اور اسکی تمام قوّتیں اپنے مستقبل کو سنوارنے اور نصبُ العین تک پہنچنے کے لیے ہیں۔ اب وہ ان قوتوں کو واپس پلٹنے کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔

رانجھے کے علاوہ ہیر کے دیگر تمام کرداروں کی معنویت کو بھی عذرا وقار نے اسی انداز میں اجاگر کیا ہے۔

اس بات کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے کہ ہیر کے قصّے کے یہ اسرار کھولتے ہوئے عذرا کسی ناروا کھینچ تان کی مرتکب نہیں ہوئی۔ فارسی کی عظیم عارفانہ مثنویوں کا پس منظر بھی اس انداز کے رمزیہ پیرائے کی مثالیں فراہم کرتا ہے اور خود وارث شاہ کے کلام میں ایسے اشارے اور قرینے موجود ہیں جو اس اُسلوبِ تشریح کی تائید کرتے ہیں اور یہ بات بھی ناگفتہ نہیں رہنی چاہئے کہ علاقائیت کی گہری چھاپ کسی فنکار کو ایک مخصوص جغرافیائی ماحول تک محدود کردیتی ہے۔ وارث کی اصل عظمت اسی میں ہے کہ علاقائیت کے حوالے سے اسکی مثنوی کی تعبیر وسیع معاشرتی اور عظیم روحانی تناظر میں کی جا سکتی ہے۔

لودھیوں کے زمانے میں پیش آنے والے اس واقعہ سے متعلق جملہ قبائل اور مقامات کے بارے میں کتاب کے آخر میں ایک نہایت مفید ضمیمہ بھی درج کیا گیا ہے

اس میں رانجھوں کھیڑوں اور دیگر قبائل کے نسبی اور سماجی احوال کی تحقیق کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تمام مقامات کی جغرافیائی تحقیق بھی شامل ہے جن کا تعلق وارث شاہ اور ہیر وارث شاہ سے ہے۔یہ تحقیق وارث کی تفہیم کے سلسلے میں بڑی کار آمد اور خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

جہاں عذرا وقار نے وارث شاہ عہد وارث کے احوال اور ہیر کی فنی اور تمثیلی حیثیت کے بارے میں اتنی کنج کاوی کی ہے وہاں ایک تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے وارث کی ہیر میں الحاقی اشعار کے مسئلے کو کہیں بھی نہیں اُٹھایا اور نہ یہ صراحت کی ہے کہ اس نے ہیر کے کس نسخے کو اپنی تحقیق اور تنقید کا محور بنایا ہے۔ حالانکہ وارث شاہ کی ہیر کے اصلی متن کا مسئلہ اساسی اہمیت کا حامل ہے اور اگر اس بنیاد میں کوئی کوتاہی ہوجائے۔تو پھر۔ تا ثریّامی رود دیوار کج۔کیونکہ اس سلسلے میں ایساہوا ہے کہ بعض دانشوروں نے اپنی تنقید کی بنیاد ایسے اشعار پر رکھی ہے جو وارث شاہ کے سمجھ لئے گئے ہیں حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

ضمناً" یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ وارث کی بحر، اسکے قافیے کا کرارا پن اور اس طرح کے دیگر عروضی پہلو اور ان کا دوسری پنجابی مثنویوں سے موازنہ ایک ضروری بحث تھی جسکی کمی محسوس ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب اور تحقیق کی دنیا میں کوئی چیز بھی حرفِ آخر قرار نہیں دی جاسکتی ۔اسکے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ عذرا وقار نے تفہیم وارث میں بڑے پُر خلوص تحقیقی تجسس اور عمدہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے ۔ اسکی یہ تصنیف اس سلسلے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب کا قاری پنجاب کی ادبی اور شعری روایت سے بھرپور تعارف حاصل کرتا ہے اور وارث شاہ کی عظمت اس پر بخوبی آشکار ہوجاتی ہے۔ اس موضوع کو آگے بڑھانے کے لئے مستقبل کا نقّاد اس کتاب کے مطالعے سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ تحقیقی موضوعات پر ایسی خیال انگیز، خوش اسلوب اور عام فہم تصانیف کم ہونگی۔ ادارہ تاریخ و تہذیب و تمدّنِ اسلامی، اسلام آباد اس کتاب کی اشاعت پر تبریک و تحسین کا مستحق ہے۔

قومی ترانہ - ایک بصری جہت

علامت ایک آفاقی وسیلۂ اظہار ہے اور اس کے ہزاروں پیرائے ہیں جو رنگوں' روشنیوں اور آوازوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لفظوں کے حوالے سے ترانہ بھی ایک علامت ہے، پرچم بھی ایک علامت ہے اور ہر قوم کی اپنی شناخت کا اظہار ہے۔

سلطان محمد فاتح نے جب استنبول فتح کیا تو ستارۂ زہرہ اور ہلال ایک دوسرے کے قران میں تھے اور یہ قران ایک طویل مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے۔ سلطان اس قران کا انتہائی خوبصورت منظر دیکھ کر بے انتہا متاثر ہُوا اور اس نے اسے اپنے جھنڈے کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کے بعد سے ہلال یعنی ماہِ نو مسلمانوں کی قومی علامت قرار پایا۔۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا۔

ایران کے ملکُ الشّعرا محمّد تقی بہار نے پاکستان سے محبّت کا اظہار کرتے ہُوئے جو نظم لکھی ہے اس میں ہمارے پرچم کی اس علامت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔

بزیر بیرق نصرٌ من اللہ اند وکنند

مہ وستارہ سعادت نثارِ پاکستان

یعنی یہ چاند اور ستارہ اللہ کی مدد کے جھنڈے کے سائے میں ہیں اور پاکستان پر سعادتیں نچھاور کر رہے ہیں۔

جھنڈے کی طرح ترانہ بھی ایک قومی شناخت کی حیثیت رکھتا ہے۔حفیظ جالندھری مرحوم کے جملہ کلام اور بالخصوص ان کے گیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ غنائیت کوان کے مزاج سے بہت مناسبت تھی اوران کا شاہنامہ اسلام سے انکی وابستگی اور شیفتگی کا آئینہ دار ہے۔ ہمارا قومی ترانہ بلاشبہ حفیظ صاحب کے میلانِ طبع کا انتہائی پروقار نقطۂ عروج ہے۔ چنانچہ پاکستان کا بچّہ بچّہ اس ترانے کی دھن سنتے ہی اپنے دل میں حُبِ وطن کا جوش محسوس کرنے لگتاہے اور اس کے مانوس آہنگ پر ہرپاکستانی کے بدن میں اس کا لہو جھومنے لگتاہے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ نے جو بہت بڑے احسانات کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے سمیع وبصیر بنایاہے۔ سورۃ الدھر کی دوسری آیہِ مبارکہ میں تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمانے کے بعد۔۔۔۔۔۔۔اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (سو ہم نے اس کو صاحبِ سماعت اور صاحبِ بصارت بنا یا ہے)چنانچہ سمع وبصر کی انسانی زندگی میں بے اندازہ اہمیت ہے۔ جب کوئی آواز کان میں پڑے اور اس کا نقش بھی آنکھ کو دکھائی دے جائے تو وہ ذہن کی گہری سطح پر مرتسم ہو جاتی ہے۔

موجودہ دَور میں ہُنرِ تدریس نے اِس اصُول سے بہت اِستفادہ کیا ہے۔ سمعی اور بصری وسائل سے ذہنِ انسانی پر تعلیمی اثرات مرتّب کرنے کا تجربہ انتہائی کامیاب رہا ہے اور اس سلسلے میں فنِّ تصویر سے مدد لینے کی عالمگیر روایت قائم ہو چکی ہے۔

آج سے تقریباً ۱۵ برس پیشتر تہران میں موجودہ دَور کے ایک ایسے ایرانی شاعر سے میری ملاقات ہوئی جو ایک شاعرِ تصویر گر کی حیثیت سے معروف ہے۔ میں نے

اس سے دریافت کیا کہ آپکی شاعری میں تصوریت کا سبب کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ "بے شک شعر اور نغمہ توأم ہیں۔ شاعری موسیقی کی ہمزاد ہے لیکن اس دور کا انسان بصریات کا خُوگر ہو چکا ہے اور آواز کو آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہے۔" شاعر موصوف کی یہ رائے میرے ذہن میں آج تک تصویر کی طرح محفوظ ہے۔

تاہم تصویر کے سلسلے میں دیگر اقوام کے ہاں جو رویّہ پایا جاتا ہے وہ بعینہٖ اسلامی روایت میں مستحسن شمار نہیں کیا گیا۔ یہاں پر صُورتگری کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں جملہ علوم وفنون میں اپنی حدُود وقیود کو برقرار رکھنا ہوتا ہے کہ یہی حدُود ہمارے ملّی وجُود کی ضامن ہیں۔

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے قیام کا مقصد ہمہ جہتی قومی منصوبہ بندی میں انہی حدود وقیود کو اجاگر کرنا ہے۔ جو کتابچہ آج کی اس تقریب کا محور و موضوع ہے وہ اس ادارے کے انہی اغراض ومقاصد کی آئینہ داری کرتا ہے۔

سولہ صفحات پر مشتمل یہ مصوّر ترانہ بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا حسنِ ظاہری جس کی طرف ہمارے ہاں اب تک بہت کم توجہ دی گئی ہے نہایت دلکش ہے۔ مصوّر نے ترانے کے ہر مصرعے کو بصری شکل دینے کے لیے مکمّل ایک صفحہ استعمال کیا ہے جس میں ترانے کا مصرع اس کے پس منظر میں اُبھرنے والی تصویر اور پایانِ صفحہ میں اس مصرعے کا پیغام درج کیا گیا ہے۔ یہ تصاویر اور یہ پیغامات نو نہالانِ وطن کے حسّاس ذہنوں پر ان اسلامی تصوّرات کی گہری چھاپ لگاتے ہیں جو پاکستان کی اساس اور اس کے وجُود کا جواز ہیں۔ چنانچہ سبز رنگ کو پاکیزگی اور خوشحالی کی علامت قرار دیا گیا ہے جس کے پس منظر میں سبز گنبد کی علامت از خود اُبھرتی ہے۔ محراب، قرآنِ مجید، مینارِ پاکستان، میزان اور پنج گوشہ ستارہ جسے دین کے پانچ ارکان کا مظہر قرار دیا گیا ہے ایسی علامتیں ہیں جو تصوّرِ پاکستان کو بخوبی اُجاگر کرتی ہیں۔

مصوّر ترانے میں جناب صغیر احمد نے رنگوں کا جو امتزاج پیش کیا ہے وہ اس

اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ ایک طرف تو وہ تقریباً سبھی رنگوں کی ایک قوسِ قزح کو محیط ہے جو تصوّرِ پاکستان کی آفاقی اور کائناتی وسعتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور دوسری طرف سبز اور نیلے رنگوں کے مختلف SHADES کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ سبز رنگ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ وہ سبز گنبد کی نسبت سے اسلامیانِ عالم کا خاص رنگ ہے اور نیلا رنگ آسمان کا رنگ ہونے کے سبب سے قیدِ مکاں سے آزادی، رفعت اور آفاقیت کا آئینہ دار ہے۔ مصوّر نے اس کتابچے میں فنِ تصویر سے متعلق ان حدود وقیود کو بھی ملحوظ رکھا ہے جو تہذیب اسلامی کے حوالے سے عاید ہوتی ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نہ صرف غیر ملکی حضرات بلکہ ہمارے ملک کے مختلف علاقوں کے ایسے لوگ بھی جوان الفاظ کو پڑھنے پر قادر نہیں ہیں وہ بھی ان تصویروں کی مدد سے ترانے کی روح تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتابچہ قومی وحدت کے فروغ کا ذریعہ بھی ہے اور اسکی اشاعت سے ہمارے قومی ترانے کا حلقہ تفہیم کشادہ تر ہُوا ہے۔

اس موقع پر بصد ادب صفحہ نمبر ۸ پر 'مومن مومن کا بھائی ہے' کے الفاظ کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ ان الفاظ کے آگے القرآن درج ہے۔ غالباً ان الفاظ کے پس منظر میں قرآنی آیت اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں) اور حدیثِ پاک اَلْمُسْلِمُ اَخُوا لْمُسْلِم (مسلمان مسلمان کا بھائی ہے) میں اِلتباسِ ذہنی واقع ہوگیا ہے۔ ہرچند کہ اس سے نفسِ مضمون میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تاہم قرآن کا حوالہ دیتے ہُوئے اگر ترجے کواصل قرآنی الفاظ کے نزدیک رکھاجائے توزیادہ مناسب ہو۔

قومی ترانے کے حوالے سے میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارا ترانہ لسانی اعتبار سے بھی ہمارے مخصوص تہذیبی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ان دونوں زبانوں کی اسلامی تاریخ اور تہذیب میں جواہمیت ہے کسی سے مخفی نہیں۔ تشکیلِ پاکستان کا اُردو کے مزاج پر جو اثر پڑا ہے وہ پاکستانی اور بھارتی اُردو کے موازنے سے صاف ظاہر ہے۔ بھارت میں پس منظر کا کام

ہندی اور سنسکرت سے لیا جارہا ہے جب کہ ہمارے یہاں عربی اور فارسی کی روایت راسخ ہے۔

پاکستان میں عربی زبان کی تعلیم و ترویج اگرچہ ہنوز اس درجے تک نہیں ہو سکی جیسی ہونی چاہیے تاہم اس میدان میں ہماری پیشرفت حوصلہ شکن بھی نہیں۔ عربی کی تدریس میں ہمارے قدم کسی نہ کسی حد تک ضرور آگے بڑھے ہیں۔ تاہم افسوس کا مقام ہے کہ فارسی زبان جو برصغیر میں تقریباً" ایک ہزار سال تک درباری 'سرکاری' اور ادبی زبان رہی ہے اور جس کے بغیر ہم اپنی ادبی روایت اور اسکے رموز علائم کو سمجھنے کے لائق نہیں ہوسکتے روز بہ روز رُوبہ زوال ہے۔

فارسی کاایک معلّم ہونے کی حیثیت سے مَیں اس حوصلہ شکن صورتحال کا ایک عرصہ سے مشاہدہ کررہا ہوں۔ فارسی وہ زبان ہے جس کے بغیر ہم مصوّرِ پاکستان حضرت علّامہ اقبال کے افکارِ عالیہ سے براہِ راست مستفید نہیں ہوسکتے اور ان افکار کی توانائی اور اہمیّت روز برروز ہماری نژادِ نَو کی نگاہوں سے اوجھل ہورہی ہے۔ فارسی زبان کے ذوق کے بغیر ہم اپنے قومی ترانے کے مفاہیم سے بھی کما حقّہٗ لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور صحیح معنوں میں اپنی قومی زبان اُردو کے بھی لطافت آشنا نہیں بن سکتے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو میرے دلِ درد مند سے بے ساختہ نکل گیا۔ انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے انتہائی قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔اس ادارے کے زیرِ اہتمام نہایت اہم ملکی اور ملّی مسائل کے بارے میں قومی نقطۂ نظر کی حامل متعدد گراں قدر کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے کئی تصانیف کو انکی اہمیت کے پیشِ نظر دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیا جا چکا ہے۔

یہ مصوّر کتابچہ اس سلسلے میں ایک گراں بہااضافہ ہے۔ مَیں اس مؤقر ادارے کے سربراہ جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب اور انکی وساطت سے ان کے تمام کارکنان کوفرداً فرداً اور جناب صغیر احمد صاحب کو خصوصاً مصوّر قومی ترانے کی اشاعت پر تہِ دل سے ہدیہ تبریک کے ساتھ دوچار شعر بھی نذر کرتاہوں۔

ہُوا تبدیل نغمہ پیکروں میں
کہ مصرعے ڈھل گئے ہیں منظروں میں

صداؤں نے رِدائیں اوڑھ لی ہیں
بڑی رنگیں قبائیں اوڑھ لی ہیں

کہیں محراب و مسجد کے نظارے
کہیں پُر روشنی کے استعارے

جمالِ کوکب شائستہ ضَو ہے
عجب حسنِ فروغِ ماہِ نَو ہے

سرِ قرطاس مینارِ درخشاں
کہ جیسے منظرِ شمعِ فروزاں

بہاروں کے طرب انگیز دن ہیں
کہ چشم و گوش دونوں مطمئن ہیں

سُنے بھی اور دیکھے بھی زمانہ
مصوّر ہو گیا قومی ترانہ